معیار: علمی و تحقیقی مجلّہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد:۲، شمارہ:۲ جولائی-دسمبر ۲۰۱۰ء

کتابُ الجواہر: فصلِ اوّل

مصنف: محمد بن احمد البیرونی، اُردو ترجمہ: عطش دُرّانی*

کتاب الجماہر فی معرفتہ الجواہر، محمد بن احمد البیرونی (۳۶۲ھ/۹۷۳ء......۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء کی وہ معرکتہ الآرا تصنیف ہے جو علم جواہر اور طبعی کیمیا میں آج بھی ایک بے مثل حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا عربی متن حیدر آباد دکن سے ۱۳۵۵ھ /۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس کا انگریزی ترجمہ حکیم محمد سعید نے کیا تھا جو ہجرہ کونسل اسلام آباد سے ۱۴۱۰ھ/۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ اب اس کی فصل اوّل کا اُردو ترجمہ اس کی ادبی اور علمی شان اور اہمیت کے حوالے سے پیش کیا جا رہا ہے۔

بسم اللّٰہ الرحمان الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین الذی لما توحد بالازل والا بد........................

حمد وثنا ہے اللّٰہ کے لیے جو کائنات کی تمام اقلیموں کا پرودگار ہے۔ وہ ازل سے ابد تک واحد ہے اور دوام کے ساتھ منفرد ہے۔ وہ دنیا میں فنا کی علّت اور بقا کی اساس کے ساتھ قائم ہے [1] اور مصائب اور مشکلات میں سلامتی اور صحت کا مرجع ہے۔ رزق تقسیم کرنے، قسمتیں بنانے اور اسباب مہیا کرنے والا ہے (صیر سببہا) [2]۔ وہ اعمال پر اسی طرح محیط ہے جیسے سورج اور چاند مسخر ہیں۔ وہ بادلوں میں پانی کو اٹھائے ہوئے ہے اور جب وہ بھاری ہو جاتے ہیں تو ہوائیں انھیں پیاسی زمینوں کی طرف لے جاتی ہیں اور یوں زمین پر برکتوں والے پانی کا نزول ہوتا ہے۔ تب زمین انواع واقسام کی کثرت ظاہر کرتی ہے جو انسانوں کے لیے دولت اور حیوانوں کے لیے چارا مہیا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ سمندروں کی طرف اور اپنے مستقر کی طرف بہہ نکلتا ہے (وہ اس کے ٹھکانے کو جانتا ہے)۔[3] اسی کو علم ہے کہ زمین کی طرف کیا آتا ہے اور اس میں سے کیا خارج ہوتا ہے اور آسمان سے کیا نازل ہوتا ہے اور اس کی طرف کیا اٹھتا ہے۔ اس کے علم کا احاطہ ہر شے پر ہے۔ اسی نے اپنی قدرت اور حکمت کے ساتھ یہ سب احکام دے رکھے ہیں۔ لاکھوں درود ہوں اس ہستی پر جس نے اندھیروں سے ہمیں نکالا، رسالت انھی

* مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

۱۔ انگریزی ترجمے میں یہ جملہ موجود نہیں۔

۲۔ انگریزی ترجمے میں ''اسلام کو سبب'' درج کیا گیا ہے۔

۳۔ بعض متون میں ایسا ہی مفہوم ہے۔

(محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ختم ہوئی۔ان پر بھی سلام جو ہدایت پا گئے اور وہ جوان کی آل سے ہوئے اور جو اہلِ بیت ہو کر معزّز ہوئے اور ان کے تمام نجیب صحابیوں پر بھی۔یقیناً توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

فصلِ اوّل

ہماری تمام حمد وثنا اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جس نے تمام مخلوقات کو اسی طرح بنایا کہ ہر شے خود کو قائم رکھ سکتی ہے اور ایک مقررہ مدت تک زندہ وقائم رہتی ہے، جس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور جن کی نشوونما کے لیے اس نے اسباب اور غذا پیدا کی اور تھوڑی سی غذا پر اکتفا کرتے ہوئے ہر قسم کی روئیدگی بڑھتی ہے اور غذا ہضم ہونے کے بعد (مخلوق کو) ثابت اور قائم رکھتی ہے [1]۔رزق ہر طرف سے ملتا ہے اور عروق میں جذب ہو کر پانی کے ساتھ پودوں کی رگوں میں پہنچتا ہے جو اس کی جڑوں سے آتا ہے اور دھوپ میں ہوا گرم ہو کر شاخوں سے اس کی تبخیر کرتی ہے اور اسے اوپر کی طرف لے جاتی ہے اور جو کچھ نیچے سے حاصل ہوتا ہے شاخوں تک پہنچتا ہے اور ان میں نمو، مقصود یعنی پتے، پھول اور پھل پیدا کرتا ہے۔

حیوان کے اعضائے انہضام سرعت کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔حیوان ارادے سے حرکت کرتے ہیں۔وہ جامد نہیں رہ سکتے۔ پیدائش کے وقت اپنی ماں سے غذا حاصل کرتے ہیں۔پھر اکناف واطراف کی جانب حرکت کرنے لگتے ہیں تو اس منبع سے محروم ہونے کے باوجود دیگر ذرائع سے رزق حاصل کر کے اسے کھاتے، چباتے اور ہضم کرتے ہیں۔اللہ نے ان کے حواس خمسہ کو اس طرح سے پیدا کیا ہے کہ ان کی مدد سے وہ رزق تلاش کرتے اور من پسند چیزیں کھاتے اور خطرناک چیزوں سے بچتے ہیں۔یہاں بصارت ان کے کام آتی ہے۔سامعہ سے آوازوں کا ادراک ہوتا ہے اور انھیں تحفظ ملتا ہے۔شامہ (سونگھنے) کی قوتوں سے اشیاء کے معیار اور ضروریات کا اندازہ ہوتا ہے تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ کون سی غذا ان کے موافق ہے اور کیا وہ اسے کھائیں یا چھوڑ دیں۔لامسہ کی قوت سے گرمی اور سردی، خشک اور تر اور سخت اور نرم کا اندازہ ہوتا ہے۔اس طرح حیوان کا قیام دنیا میں یقینی ہوتا ہے اور وہ بھاگتا پھرتا ہے۔[2]

ترویحہ[3]

حواس معتدل اثرات ہی کو محسوس کر سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ حد سے نہ بڑھ جائیں اور نقصان نہ پہنچائیں مثلاً بصری قوت بصارت کے لیے ہے۔روشنی مختلف اشیا کو ان کے رنگوں اور خاصیتوں کے ساتھ ظاہر کرتی ہے، یعنی ان کے خدوخال اور اشکال وہیات وغیرہ۔سامعت آوازوں کو محسوس کرتی ہے جو ہوا کے دوش پر منتقل ہوتی ہیں۔شامہ سے بُو کا ادراک ہوتا ہے جو بُخارات کی صورت میں عطریات سے نکلتی ہے اور اس کے اجزا ہوا میں پھیل جاتے ہیں۔ذائقے کی قوت کھانوں کو پہچانتی ہے۔اس کے لیے زبان، تالو اور حلق رطوبات کا سہارا لیتے ہیں۔اگر یہ خشک ہوں تو جسم ذائقے کو محسوس نہیں کر سکتا۔

یہ چاروں حواس جسم کے مختلف حصوں سے وابستہ ہیں اور اپنی حد سے نہیں بڑھ سکتے۔پانچویں حس لامسہ کی ہے جو سارے جسم میں موجود ہوتی ہے اور تمام اعضا سے متعلق ہے اور ان کے ذریعے ہر جگہ ہوتی ہے۔اس کے لیے کوئی ایک عضو مخصوص نہیں، جیسے ہی کوئی چیز جسم کے ساتھ چھوتی ہے، یہ احساس بیدار ہو جاتا ہے اور چونکہ پہلے جلد چھوتی ہے، اس لیے جلد ہی سب سے پہلے لمس کی قوت کا اظہار کرتی ہے۔آہستہ آہستہ اندرونی اعضا متاثر ہوتے ہیں اور پھر جلد پر سے لمس کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب خوراک اندرونی اعضا میں پہنچتی ہے تو اندرونی طور پر ان کا احساس نہیں ہوتا۔

ترویجہ

حیوانوں میں حواس حصولِ آب ودانہ کا ذریعہ ہیں لیکن انسان اپنی قوتِ تعقل کی بنا پر ان پر تفوق پاتا ہے۔ چنانچہ وہ ان حیوانوں میں افضل ترین ہے۔ اسی لیے وہ خلافت ارضی کا اہل ٹھہرتا ہے اور یوں وہ سیادت وقیادت انجام دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ زمین طوعاً کرہاً اس کے لیے مسخر کردی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔[۴]

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہماری قدرت نے ان کے لیے کیسے مویشی پیدا کیے ہیں جن کے وہ مالک بن جاتے ہیں اور وہ ان کے مطیع ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض پر وہ سواری کرتے ہیں اور بعض کو خوراک ٹھہراتے ہیں۔ ان سے اُن کے لیے فائدے اور مشروب حاصل ہوتے ہیں۔ کیا وہ شکر گزار نہیں بنتے؟'' (یاسین ۳۶:۷۱تا۷۳)

کیا یہ انسان کے لیے اللہ کی نعمتیں نہیں جبکہ وہ حقیر اشیاء پر بھی قابو پانے کا اہل نہیں۔ اسے تو اتنی بھی قوت حاصل نہیں کہ وہ ان قوتوں سے اپنا دفاع کر سکے جن کو اس نے مسخر کر لیا ہے۔ اللہ سبحانہ کا فرمان یہاں منطبق ہوتا ہے کہ:

''پاک ہے وہ ذات جس نے اسے تسخیر کر دیا جب کہ ہم اس قابل نہ تھے'' (الزخرف ۴۳:۱۳)۔

جب اسے یہ انعامات عطا ہوئے اور وہ ان مخلوقات میں سے منتخب ہوا کہ وہ سعی وکوشش سے چیزیں حاصل کرے تو دو حواس سماعت اور بصارت ہی محسوسات سے معقولات کے درمیان واسطہ ٹھہرے۔ بصارت اس امر پر شاہد ہوئی کہ اس سے مخلوقات میں حکمت کے آثار اور مصنوعات سے صانع کا استدلال کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''ہم انھیں آفاق اور ان کے اپنے نفسوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے جس سے انھیں باور ہو جائے گا کہ یہ حق ہے''۔ (فصلات ۴۱:۵۳)

پھر فرمایا:

''کس نے سات آسمان تہ درتہ پیدا کیے۔ تم (اے محمدؐ) رحمان کی تخلیق میں کوئی تفاوت نہ دیکھو گے۔ پھر دیکھو! کیا تمھیں کوئی فتور نظر آتا ہے۔ بار بار نظر دوڑاؤ تمھاری نظر مایوس ہو کر لوٹ آئے گی''۔ (الملک ۶۷:۳۔۴)

نیز فرمایا:

''کتنے ہی لوگ ہیں جو زمین وآسمان کی نشانیوں سے مونھ موڑ کر گزر جاتے ہیں''۔ (یوسف ۱۲:۱۰۵)

انسان کو حسِ سماعت اس لیے عطا ہوئی ہے کہ وہ امر ونہی کا ادراک کر سکے اور حق وصداقت کی رسی کو مضبوطی سے تھام لے اور اللہ کا قرب حاصل کر لے اور اطمینانِ قلب پائے۔ یہ ایسی چیز نہیں جو خاص وعام سے مخفی ہو۔ اعشیٰ بن ربیعہ کا شعر ہے ؎

کان فؤادی بین جنبی عالم
بما ابصرت عینی و ما سمعت أذنی

(کاش میرا قلب وہی کچھ جانتا کہ عالم میں جو کچھ میری آنکھیں دیکھتی اور میرے کان سنتے ہیں)۔[۵]

یہاں شاعر نے اثبات کیا ہے کہ حصولِ علم کے لیے یہ دونوں حواس بڑا ذریعہ ہیں لیکن الجھن قلب کے لیے ہے، ذہن کے لیے نہیں جیسا کہ عام طور پر کہا گیا ہے اور فرمان الٰہی ہے:

''بے شک سمع وبصر وفواد (قلب)، سب سے پوچھا جائے گا''۔ (الاسراء ۱۷:۳۶)

ابوتمام کا شعر ہے ؎

و مـمـا قـالـت الـحـکـمـاء طـرّا
لسـان الـمـرء مـن خـدم الـفـؤاد

(تمام اہل دانش کہتے ہیں کہ زبان قلب کی خادمہ ہے)

جمیل بن معمر العذری کا شعر ہے ؎

اذا کـنـا بـمـنـزلۃ لـلـهـو
یـخـاف الـسـمـع فیـه و الـعـیـونـا

(اپنے کھیلوں میں مشغول ہوتے وقت ہمیں کان اور آنکھ سے خوف ہوتا ہے)

اس کا سبب یہ ہے کہ یہ آلات رقیب ہیں۔ وہ مخلل انداز ہوتے اور راز پاتے ہیں۔

نعمت کی قدر اس کے کھو جانے کے بعد آتی ہے اور سماعت کا فائدہ صرف بہرے کو اور بصارت کا اندھے کو معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''کیا تم اندھوں کو ہدایت نہیں دے سکتے خواہ وہ دیکھ نہ سکیں''۔ (یونس ۱۰:۴۳)

نیز اسی سورہ میں فرمایا:

''کیا تم بہروں کو سنا نہیں سکتے خواہ وہ عقل نہیں رکھتے''۔ (یونس ۱۰:۴۲)

اللہ نے منکرین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اس کے سوا کون ہے جو دن اور رات کو لاتا ہے۔ دیگر حواس نفس سے ملحق اور انسانیت کی نسبت حیوانیت کے قریب ہیں۔ یہ بجا ہے کہ ان (تمام) حواس کے ذریعے انسان فکر و استنباط کی اعلیٰ سطح پر پہنچ پایا ہے۔

ترویحہ

اُنس متجانس ہونے کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جنس باہم جنس پرواز کرتا ہے۔ پرندے اپنے ہی رفیق کو ڈھونڈتے ہیں۔ گونگے کے نزدیک سب لوگ گونگے ہیں کیونکہ وہ دوسروں سے ایسا کوئی استفادہ نہیں کرسکتا۔ اگرچہ علامات بنانے اور انگلیاں متحرک کرنے سے وہ اپنا مطلب بیان کرسکتا ہے۔ گونگا دوسرے گونگے سے صرف اسی وقت مسرت حاصل کرسکتا ہے جب وہ اسے اس قابل پاتا ہے کہ وہ اسے سمجھ سکے جبکہ عام طور پر دوسرے لوگ اسے سمجھ نہیں پاتے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''وہی ہے جس نے تمھیں نفس واحدہ سے پیدا کیا اور اسی سے تمھارے جوڑے بنائے جن سے سکون پاتے ہو''۔
(الاعراف ۷:۱۸۹)

پھر فرمایا:

''اور اس کی نشانیاں یہ ہیں کہ اس نے تمھی میں سے تمھارے ازواج پیدا کیے جن سے تم سکون پاتے ہو اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا''۔ (الروم ۳۰:۲۱)

باہمی الفت خوف اور نفرت کی قیمت پر عشق کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ اسی لیے ان کے مابین کوئی مشترک عنصر موجود ہوتا ہے جو باہمی الفت میں گرفتار ہوتے ہیں جس کی بنا پر محبت فزوں تر ہوتی رہتی ہے۔ انسان کی آبادی بڑھنے اور انسانوں کے باہمی اشتراک و تعاون ہی

کے سبب سے بستیاں اور شہر وجود میں آتے اور پھیلتے جاتے ہیں۔

ترویجہ

انسان اپنی جبلت کے لحاظ سے مختلف خصوصیات سے وجود پذیر ہوا ہے جو اپنی متضاد فطرت کے ساتھ اس میں جمع ہوئی ہیں۔ نفس یا دم اس کے مزاجِ بدنی کا ماتحت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فرد منفرد اور مختلف مزاج رکھتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی چیز جو مختلف اشیاء کے ملاپ سے وجود پذیر ہوتی ہے، اس وقت فوراً معدوم ہو جاتی ہے جب انھیں جوڑنے والی قوت ہٹالی جاتی ہے اور ہر مخالف اپنی ضد پر اثر چھوڑتا ہے۔ اس لیے انسان اور حیوان بیماریوں اور آفات وحوادث کا شکار ہوتا ہے کیونکہ بیرونی مخالف اندرونی ضد کے ساتھ ٹکراتا ہے۔

انسان اپنی ذات میں انھیں دفع کرنے کے ذرائع نہیں پاتا۔ چنانچہ بیرونی قوتیں اس پر نحوستوں اور بیماریوں کی صورت میں اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان پر قابو پانے کے لیے وہ بیرونی عناصر اور محرکات پر انحصار کرتا ہے تاکہ وہ اس کی مدد کو آئیں۔ اس لیے وہ ان کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ وہ ان سے تحفظ حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے۔

تموت مع المرء حاجاته
وتبقى له حاجة ما بقى

(انسان کے ساتھ ہی ساری خواہشیں مرجاتی ہیں اور جب تک زندہ رہتا ہے وہ اس کے ہمراہ رہتی ہیں)

یہ تمام نحوستیں اور بیماریاں جنس واحدہ نہیں، بس وہ ان کا بار برداشت کرتا ہے اور ایک عنصر اس کے لیے کافی ہونا چاہیے۔ ان کی کئی انواع ہیں اور یوں صرف ایک طرح کی مزاحمت ان سب کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ اسی لیے انسان کو تہذیب و تمدن کی ضرورت لاحق ہوئی لیکن اپنی فطرت کے لحاظ سے وہ تندخو اور جھگڑالو ہے۔ وہ اپنی طاقت اور اپنے تشکیل کردہ گروہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ لیکن جیسا کہ فطرت کا دستور ہے بستیوں میں یہ گروہ مختلف جذبات اور دباؤ کے تحت وجود میں آتے ہیں کیونکہ تمام بنی نوع انسان ایک ہی قوت کی طرف مائل نہیں ہوتے اور افضل ادنیٰ کی پیروی نہیں کرتے اور سب یکسانیت کا شکار نہیں ہوتے۔

چونکہ مختلف گروہوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہوتے ہیں، اس لیے مختلف قسم کے پیشے اور صنعتیں وجود میں آتی ہیں۔ بااختیار گروہ جبر و زور کے ذریعے دوسروں پر قابو پاتا اور ان کی محنت کا معاوضہ ادا کرتا ہے لیکن صرف طاقت کے بل پر کام نہیں کرایا جاسکتا۔ مختلف گروہوں کی مختلف ضروریات اور مختلف توجہ کے باعث انھیں مختلف اوقات پر لاکھڑا کرتا ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ایک گروہ کے پاس ایک جنس کی کثرت ہوتی ہے یا وہ اس کے استعمال سے آگاہ نہیں ہوتا۔ یہ بات لوگوں میں رقم کی بجائے قیمتی اشیاء کے تبادلے کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے ایسی اشیاء کا انتخاب کرنا شروع کیا جو قیمتی، دلپسند، نادر اور عرصے تک رہنے والی ہوں۔ اسی لیے انسان نے اشیاء کی تقطیع، بہتر مادے کے انتخاب، انھیں چھوٹا بڑا کرنے اور ان پر یکسانیت کا اصول لاگو کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس سے ان پر تصویریں اور نمونے کندہ کرنا شروع کیے لیکن اس طرح کہ ان کی اصل شکل برقرار رہے۔

اللہ عزوجل نے انسان کو تخلیقات کے اسباب پر آلات اور فہم وادراک کی نشانیوں پر عقل سے کام لینے کی قدرت عطا کی ہے۔ اس نے انسان کی طرف رسولوں کو اس کی عاقبت سنوارنے کے لیے بھیجا۔ بادشاہوں کو اپنے خلیفہ کے طور پر مقرر کیا تاکہ وہ مذہبی امور میں انصاف اور مساوات قائم کریں۔

پس اللہ نے اپنی وسیع تر رحمت اور محبت کے ناتے انسان کی تخلیق سے بہت پہلے ہی کوہساروں تلے ایسے ثقیل مادے بھر دیے جنھیں وہ اپنے فائدے کے لیے کھود کر نکال سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

''یہ زمین جو ہم نے بچھائی ہے، اس میں مضبوط پہاڑ جمائے ہیں اور اس میں موزوں اشیاء پیدا ہونے کا سبب ٹھہرایا ہے''۔ (الحجر ۱۵:۱۹)

اللہ نے انسانوں کے تمام پیشوں اور ہنروں کو چاندی اور سونے پر راجع کیا ہے۔[۶] یہ دھاتیں اشیا کی قیمتیں مقرر کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ اللہ نے انسان کو ان دھاتوں کے حصول کا طریقہ بتایا ہے چنانچہ وہ انھیں معادن سے نکالتا ہے جہاں یہ اشیا نامعلوم مدت سے موجود تھیں۔ وہ انھیں جعل کے دھوکے سے محفوظ رکھتا ہے اور پگھلا کر ساری ملاوٹیں نکال دیتا ہے۔ ہر حق کے مقابل ویسا ہی باطل موجود ہے۔ باطل کا مبلغ چاہتا ہے کہ باطل کی تبلیغ ہو۔ اس لیے حق کے پیروکاروں پر لازم ہے کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں کیونکہ وہ انسانوں میں خلیفہ کے طور پر منتخب ہوئے ہیں تاکہ وہ اللہ کے احکام نافذ کریں، انصاف اور مساوات قائم کریں اور ہر پست و بالا، کمزور و طاقتور کو ایک نظر سے دیکھیں۔ اللہ انھیں یہ غرض و غایت پوری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ترویجہ

جب اللہ نے مصائبِ حیات اور تصرفاتِ معاش کو سونے اور چاندی کے ذریعے سہل کر دیا تو انسان ان کے مالک بن بیٹھے۔ ان کے دل ان کی طرف مائل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ سونا اور چاندی ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے حصول اور ذخیرے کے حوالے سے انسان لالچی اور حریص بن گئے۔ چنانچہ دونوں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا۔ ان کی یہ حیثیت ان کی داخلی خاصیتوں کی بنا پر حاصل نہیں ہوئی بلکہ اس کا باعث انسان کا بنایا ہوا نظامِ مبادلہ ہے اور نہ ہی یہ دھاتیں کسی شرعی حوالے سے بہتر درجے کی مالک ٹھہرتی ہیں۔ دونوں پتھر ہی تو ہیں۔ اپنی ماہیئت میں وہ نہ تو بھوک کو مٹا سکتی ہیں اور نہ پیاس کو اور نہ ہی وہ کوئی مصیبت یا خوف دور کر سکتی ہیں۔ ایسی چیز جو نہ تو کسی ذی روح کی غذا بن سکتی ہے اور نہ ہی اس کی بقا کے لیے ضروری ہے اور نہ ہی اسے گرمی، سردی سے بچا سکتی ہے اور نہ ہی اسے باطل سے دور رکھ سکتی ہے تو پھر کیوں کر درست قرار دی جا سکتی ہے۔ ان کا جواز صرف استعارۃً اور مجازاً ہی ہو سکتا ہے کیونکہ ایسے عامل کے ذریعے ہی انسان اپنی ضرورتیں پوری کرتا ہے[۷] .... یہی وجہ ہے کہ انھیں عالمی قبولیت حاصل ہے کیونکہ وہ ہر طرح کے معاملات طے کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''یہ مقرر ہو چکا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آن لیتی ہے تو وہ اپنی دولت کے بارے میں وصیت ....'' (البقرہ ۲:۱۸۰)

نیز فرمایا:

''یہ خیر کو روکتی، گناہ کی ترغیب......'' (القلم ۶۸:۱۲)

اور ایک اور جگہ فرمایا:

''اور وہ اس کی محبت میں شدید ہو جاتا ہے''۔ (العادیات ۱۰۰:۸)

عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ جو شخص دولت خرچ کرتا ہے وہ تمام اچھی چیزیں لے سکتا ہے کیونکہ دولت چیزیں خرید سکتی ہے اور یہ دولت

کی خاصیت ہے۔

ایک بحری مسافر نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ جس کشتی میں سفر کر رہا تھا وہ سمندری طوفان کے باعث کسی نامعلوم جزیرے تک پہنچ گئی۔ وہ اور اس کے ساتھی ساحل پر اترے اور جزیرے کے اندر چلے گئے۔ اس نے اپنے ساتھی کو ایک دینار دیا تاکہ وہ ضرورت کی اشیا خرید سکے۔ اس کے ساتھی نے سکے کو الٹا کیا، اسے سونگھا اور اس پر پھونکا۔ جب اس کے حواس خمسہ سکے سے کچھ حاصل نہ کر پائے تو اس نے اسے واپس کر دیا کیونکہ وہ کسی ایسی چیز کے بدلے میں کوئی اچھی چیز نہیں دے سکتا جو بدلے میں کوئی قابلِ قدر شے نہ لاسکتی ہو۔ دراصل مبادلہ کا یہ اصول تو تمدن کی پیداوار تھا اور ادل بدل کا یہ نظام کسی معاشی نظام کی بنا پر قائم تھا لیکن رسم ورواج نے ادل بدل کا مفاد دھات کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ اللہ نے دلوں کو دھاتوں کی محبت میں اس لیے مبتلا کیا ہے تاکہ وہ انسان کی بہتری اور بھلائی کے لیے خرچ ہوں اور اس لیے نہیں کہ یہ دھاتیں بذات خود کوئی فضیلت رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''جان لو کہ اس دنیا کی زندگی مال واولاد کے حوالے سے صرف کھیل تماشا ہے اور زینت اور تفاخر اور تکاثر ہے''۔

(الحدید۵۷:۲۰)

نیز فرمایا:

''انسان کے لیے مرغوب بنادیے گئے ہیں عورتیں اور بچے اور چاندی سونے کے ذخیرے اور گھوڑے جو نشان زدہ ہو کر دوڑتے ہیں اور مویشی اور زمینیں۔ یہ صرف دنیاوی زندگی کا سامان ہیں اور اللہ کے پاس بہتر اجر ہے''۔

(العمران۳:۱۴)

چنانچہ اللہ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ ثقافت کی بہتری عورتوں میں، آنکھ کی ٹھنڈک بچوں میں، دل کی قوت دولت سے حاصل ہوتی ہے لیکن دولت بھیک، سلطنت، رہن اور زراعت سے حاصل ہوتی ہے اور جو اسے ذخیرہ کرتے ہیں ان کے بارے میں فرمایا:

''جو لوگ سونے چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں اور انھیں اللہ کے راستے پر خرچ نہیں کرتے تو انھیں (اے محمدؐ) دردناک عذاب کی بشارت دے دو''۔ (التوبہ۹:۳۴)

''اللہ کی سنت'' یہ ہے کہ ایسے لوگ اس لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ وہ دوسروں کی بھلائی کے لیے کام کریں تاکہ وہ بھی اپنی ضرورتیں پوری کر سکیں، دولت کو ایک سے دوسرے ہاتھ تک جانے دیں لیکن اگر دولت روک لی جائے تو لوگ اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم ہو جاتے ہیں اور یہ بات اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی۔ اس لیے ان دھاتوں کو اس حالت میں لوٹا دیا جائے گا جیسا کہ وہ زمین میں دفن کی صورت میں تھیں۔ یہ بات کسی بچے کو رحمِ مادر میں واپس بھیجنے کی مانند ہے۔ ایک بار جب سونا اور چاندی معدن سے نکال لیے جائیں تو وہ ہل چلاتے ہوئے کھیت یا قربانی کے جانور کی مانند ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کا کوئی اور مصرف اس کے سوا نہیں رہ جاتا کہ انھیں استعمال میں لایا جائے۔ یہی صورت معدن سے نکالی جانے والی دھاتوں کی ہے۔ انھیں درہم اور دینار کی شکل میں ڈھالا جائے اور تجارت کے لیے ایک سے دوسرے ہاتھ تک منتقل ہوں اور یوں حقوق پورے ہوں۔

ترویجہ

انسانی خصوصیات مثلاً آدمیت اور مرّوت اس کے حالات اور خاندان سے متعلق ہوتی ہیں لیکن فتوت نہیں۔ یہ آخری خصوصیت کوئی

مخفی نوعیت نہیں رکھتی۔انسان اپنی ذات اور دولت کی ملکیت کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن جب دوسروں کی ذمہ داریاں اٹھاتا ہے تو مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ وہ سہل بھی ہو سکتی ہیں اور وہ اپنی اس دولت میں خست اور بخل کا مظاہرہ نہیں کرتا جو اس کے لیے مباح اور دوسروں کے لیے حرام ہوتی ہے۔ وہ مہربان ہوتا ہے اور اپنے اثر ورسوخ، تلطف، حلیمی، سنجیدگی، صبر واستقامت، تواضع اور شائستگی کے حوالے سے شہرت پاتا ہے۔ وہ اعلیٰ قدروں کی طرف بڑھتا ہے گو ان کا اہل نہ ہو لیکن ان کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

جحظہ برمکی نے بصرہ کے ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو پھٹے پرانے کپڑے پہنتا تھا لیکن دوسرے کی ضرورتیں پوری کرنے میں مستعد رہتا تھا۔ جب اس سے یہ پوچھا گیا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ اس نے بہترین شراب سے لطف اٹھایا، اعلیٰ موسیقاروں سے عمدہ موسیقی سنی اور ان خوبصورت لمحوں میں مگن ہوا، جب بلبلیں درختوں پر چہچہاتی تھیں، لیکن حقیقی مسرت اسے کبھی حاصل نہ ہوئی جیسی ان لوگوں کے ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ سے ملتی ہے جن کی خدمت میں وہ سرگرم رہتا ہے۔

فتوت مزاج کی حلیمی کا دوسرا مقبولِ عام نام ہے جس میں دوسروں پر دولت خرچ کرنا، معروف امور میں مشغول رہنا اور دوسروں کو دکھ اور تکلیف پہنچانے سے باز رہنا ہے۔

جب ایک بااثر شخص نے اسماعیل بن احمد سامانی کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا جس میں اپنے قابلِ فخر معززین کے نام درج کیے تو اسماعیل نے اس کی درخواست پر لکھا: ''عصام جیسے بنو اور اپنے معززین پر فخر نہ کرو۔ (کن عصامیا لا عظامیا)۔'' [8] پھر کسی شاعر کا یہ شعر لکھا ۔

نفس عصام سودت عصاما
وعلمته الکر والا قداما

(عصام کے کردار نے اسے عصام بنایا اور اسے اقدام کرنے اور محافظ بننے کا گر سکھایا)

اللہ تعالیٰ نے ایسے موقع کے لیے فرمایا ہے:

''مالِ دنیا کا حُب تمھیں راستے سے بھٹکا دیتا ہے حتیٰ کہ تم قبر تک پہنچ جاتے ہو''۔ (التکاثر ۱۰۲: ۱تا۲)

کسی یونانی کا قول ہے کہ جو اپنے اسلاف پر فخر کرتا ہے مردہ ہے اور جو اپنی صلاحیتوں پر انحصار کرتا ہے زندہ ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ۔

اذا المرء لم ینھض بنفس الی العلی
فلیس العظام البالیات بمفخر

(جب کوئی شخص اعلیٰ قدریں ظاہر نہیں کر سکتا تو پرانی ہڈیاں تو اسے کوئی افتخار نہیں دے سکتیں)

بعض افراد ایسے ہیں جنھوں نے فتوت میں بہت حد تک افراط وتفریط سے کام لیا۔ ذلّت اور بدنامی سے بچنے کے لیے جبر واستبداد کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور ہمسایوں کے حقوق ادا کرنے کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کی پروا نہیں کی۔ عام عربوں کے بارے میں ہم نے سنا ہے کہ وہ اپنے مہمانوں اور پناہ لینے والوں کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دیتے تھے۔ بعض نے اس مردانگی کے اظہار میں جنون کی حد تک عمل کیا کہ وہ ایسے شخص کے قتل کے لیے بھی تیار رہتے تھے جس نے ان کے خیمے کے پاس سکونت پانے والی کسی ٹڈی کو بھی نقصان پہنچایا۔ حاتم طائی جیسے سورما بھی ہیں جنھوں نے فیاضی کی اعلیٰ ترین مثال پیش کی ہے کہ موت کے قریب پہنچ کر بھی وہ اس کے لیے دشمن کے نیزے کو زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔ ایسی ایک اور مثال کعب بن مامہ ایادی کے ایثار کی پیش کی جا سکتی ہے کہ قریب المرگ جب اسے پانی کا

پیالہ دیا گیا تو اس نے یہ پیالہ اپنے نمیری ساتھی کو دے دیا جبکہ وہ خود پیاس کے ہاتھوں مر رہا تھا۔

ایسے موقع کے لیے کسی شاعر نے خوب کہا ہے ع

الجود بالنفس اقصی غایتہ الجود

اور آخر میں کہا ہے۔

ولیس فتی الفتیان من راح و اغتدی
لشرب صبوح اولشرب غبوق
ولکن فتی الفتیان من راح واغتدی
لضر عدو او لنفع صدیق

(جری وہ نہیں جو جتنی شراب صبح پیتا ہے شام کو اس سے تین گنا پیئے بلکہ وہ ہے جو صبح و شام دشمن کو ضرر اور دوست کو فائدہ پہنچاتا ہے)

علی بن جہم کا کلام ہے۔

ولا عار ان زالت عن الحر نعمتہ
ولکن عارا ان یزول التجمل

(کسی نعمت کا ولی نعمت کے ہاتھوں ضائع ہونا ذلت کی بات نہیں بلکہ ذلت کی بات تو یہ ہے کہ کوئی اپنی عزت نفس کھودے)

پہلا شعر فتوت کو بیان کرتا ہے۔اس پر وہی شخص قادر ہو سکتا ہے جو سخی ہو اور اس کا تعلق متمول افراد سے ہو۔اکثر یہ ہوتا ہے کہ دو افراد ایک سی کوشش کرتے ہیں لیکن تقدیر ان میں سے ایک کے ساتھ یاوری نہیں کرتی لیکن کوئی ایسے شخص کو موردالزام نہیں ٹھہراتا جسے قسمت نے شکست دی ہو۔

آخری (علی بن جہم کا) شعر مروّت کو بیان کرتا ہے کہ اشراف اپنے قدموں کو پیچھے نہیں ہٹاتے۔وہ اپنی سوءِ قسمت کو چھپانے اور لوگوں کے سامنے تونگری ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔لوگ ان کی اصل حالت کو نہیں جانتے اور انھیں دولت مند خیال کرتے ہیں اور چونکہ وہ مدد کے طالب نہیں ہوتے، اس لیے وہ جسم و جان سے سفید پوش نظر آتے ہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان پر اللہ کا فضل ہے۔ان کا یہ فعل اللہ کے اس حکم کے مطابق ہوتا ہے۔

''اپنی خیرات کسی کو تکلیف دے کر یا ملامت پہنچا کر مت دو......'' (البقرہ ۲:۲۶۴)

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت دی ہے کہ ایسے لوگوں کی خیرات جو کسی شر انگیز مقصد کے لیے دی گئی ہو بذاتِ خود شر ہے۔چونکہ وہ کسی خیر کے احساس یا قربِ الٰہی کے سبب سخاوت نہیں کرتے، اس لیے وہ کسی ثواب کے مستحق نہیں ٹھہرتے۔

ترویحہ

کوئی عاقل شخص صرف ایسے نفسانی امور سے لذت حاصل کرے گا جو باقی رہ سکیں اور احمق ایسے لذائذ سے بے خبر ہے اور وہ ایسے

مزے کو اپنی حدِ بصیرت قرار دے گا۔ ہم حیوانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ خاک میں لوٹ کر الگ الگ مزے لیتے ہیں۔ پھر اس انسان کا کیا ہوگا جو ان مزوں کی ماہیئت سے لطف لیتا ہے۔ عاقل شخص ان سے تعقلی لطف لیتا ہے اور خوبصورت اشیاء کا مشاہدہ گہری نظر سے کرتا ہے جس سے اس میں اخلاقیات کی بلند تر سطح پیدا ہوتی ہے۔ احمق ان سے صرف حسی لطف حاصل کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شب و روز شراب اور زہر ہی میں غرق رہتا ہے۔

ان افراد کی مدتِ لطف بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ جب لطف اپنی حد کو لوٹتا ہے تو وہ زرد مریل سے ہو جاتے ہیں۔ ان کی تازگی ختم ہو جاتی ہے اور وہ خشک گھاس کی مانند ہو جاتے ہیں جسے ہوا ادھر ادھر بکھیرتی رہتی ہے اور انھیں ایسی خاک بنا ڈالتی ہے جسے سیلاب بہا کر لے جاتے ہیں۔ وہ بیکار ہو کر رہ جاتے ہیں اور پھر ان کے پاس خالی خولی یادوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ گلاب اور زرد چنبیلی جیسے عارض، نرگسی آنکھیں، گلِ لالہ اور انار کی مانند سرخ لب، بابونہ کی مانند دانت جو بارش کی پھوار جیسے چمکتے ہیں، جسے خطمی اور بنفشہ کی لڑیوں کا تناظر حاصل ہوتا ہے۔ کچھ عبوری عرصے کے لیے یہ وہ انسانی خصائص ہیں، سلسلۂ شب و روز سے جنھیں زوال حاصل ہوتا ہے۔ وہ جنت کی حوروں اور غلمان کی طرح سدا جوان اور خوبصورت نہیں رہتے۔ اللہ نے ان کے لیے جو احترامِ مذہب کو شعار بناتے ہیں، متحرک سمندروں کی تہ میں سے زمین اور پہاڑوں کے چشموں میں، جنت کے حسن کی مانند موتی اور جواہرات جیسی چیزیں پیدا کی ہیں جن پر وقت کا اثر نہیں ہوتا۔ اللہ کا فرمان ہے:

''ان دونوں سے موتی اور مرجان پیدا ہوتے ہیں۔ تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتیں جھٹلاؤ گے''۔ (الرحمان ۵۵:۲۲،۲۳)

''ان سے وہ زیور نکالتے ہو جو تم پہنتے ہو''۔ (النحل ۱۶:۱۴)

نیز حوروں کی خوبصورتی کو یاقوت اور مرجان سے تشبیہ دی ہے۔ اللہ کا فرمان ہے:

''(حسن میں) یاقوت اور مرجان کی مانند ہیں''۔ (الرحمان ۵۵:۵۸)

موتی اور پتھر صرف آرایش کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور سونے چاندی کی طرح ان کا کوئی اور مصرف نہیں۔ اعلیٰ دھاتوں کی طرح انھیں بھی سکے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ تاہم موتی اور جواہر بعض امراض میں ادویہ کے طور پر بھی اسی طرح استعمال ہوتے ہیں جس طرح ان کی چمک دائمی ہوتی ہے اور آنکھوں کو بھلی لگتی ہے۔ لیکن روح کے جواہر کے مقابلے میں ان کی کوئی قدر نہیں۔ ابوبکر خوارزمی نے ایک شخص کا قول بیان کیا ہے:

''وہ شرافت کا دُرِّ دُرّاں ہے، وہ موتی نہیں جو صدف سے نکلتا ہے اور حریت کا یاقوتِ یاقوتاں ہے جو پتھروں سے حاصل نہیں ہوتا''۔

ترویحہ

ہر مسرت بخش شے وہی ہے جو مستقل استعمال کے باوجود مسرت بخش رہے۔ یہ وہ مسرتیں ہیں جو حواس سے حاصل ہوتی ہیں۔ جب وہ کسی نئی شے کا سامنا کرتے ہیں تو اس سے راحت حاصل کرتے ہیں۔ لیکن یہ انسانی نفس کو متاثر کرتے ہیں اور اگر حواس مختل ہو جائیں تو منتشر نفس راحت نہیں پا سکتا۔ نیند کی حالت میں قوتِ متخیلہ اقلیمِ فکر تک محدود رہتی ہے۔ لطف آواز میں نہیں بلکہ اس کے پیچھے موجود معنی کے عرفان میں ہوتا ہے۔ اگر نغمات معنی سے خالی ہو جائیں تو قلب پر گراں گزرتے ہیں چنانچہ طبیعت خاموشی اور سکون کی طالب ہونے لگتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر لذت اپنے انجام پر رنج و غم لاتی اور مرض پیدا کرتی ہے۔ ان کا تسلسل نقصان دہ ہوتا ہے۔ لذیذ خوراک اس کی

ایک مثال ہے۔بہترین خوراک بھی متواتر کھانے سے اپنی لذت اس حد تک کھو بیٹھتی ہے کہ بالآخر اس کا انجام قے پر ہوتا ہے۔لطف آگیں ہونے کی بجائے وہ بدن کے لیے ناگوار ہو جاتی ہے۔میں یہ بیان قارئین کو اس امر کے اثبات میں دے رہا ہوں کہ دنیوی لذات نقصان دہ ہیں اور ان کے ظاہری محاسن ہی درحقیقت ان کے عیوب ہیں۔

جماع کی مثال لے لیں۔شہوت پرست اس سے کیا چاہتا ہے۔وہ اپنے ساتھی کے ساتھ ہم بستری ہی نہیں کرتا بلکہ چاہتا ہے کہ سارے کا سارا اس کے بدن میں گھس جائے جبکہ وہ اس کی طاقت نہیں رکھتا اور اگر وہ یہ حالت حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتا اور دمِ واپسیں نہیں رکھتا تو ان کی حرکت انھیں سینے سے سینہ، دل سے دل، سانس سے سانس ملاتے اور ساتھی کی روح تک اتر کر دیکھنا چاہتی ہے۔جو اس میں حد سے گزرنا چاہتے ہیں وہ اپنی زبان دوسرے کے مونھ میں یہاں تک ڈال دیتے ہیں کہ وہ حلق تک جا پہنچتی ہے اور اس کے لعابِ دہن اور جبڑوں کو چوستے ہیں۔اسی طرح اندامِ نہانی کے ساتھ وہی عمل کرتے ہیں جو زبان کے ساتھ کرتے ہیں۔وہ دہرا عمل کر کے دہرا لطف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔پھر وہ بے دم ہو کر گر جاتے ہیں۔گویا انھوں نے کسی تکلیف دہ فعل کو انجام دیا ہو۔ان کی حالت واقعی قابلِ رحم ہوتی ہے۔وہ اس کمزوری پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب وہ دور ہو جاتی ہے تو اپنی لذت کی طرف پھر سے راجع ہو جاتے ہیں۔انسان اپنی طاقت کی حد تک بہیمیت پر اتر جاتا ہے۔(عباسی خلیفہ) المتوکل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مستقل جماع نے اس کے بدن کو کھوکھلا اور بھدا کر دیا تھا، پھر بھی وہ باز نہ آتا تھا۔ایک حوض میں پارہ بھرا جاتا تھا اور اس پر اس کا بستر بچھا ہوتا تھا تاکہ اس کام کے لیے اسے از خود حرکت نہ کرنا پڑے۔جب وہ اس بستر سے لطف اندوز ہوا تو اس نے پارے کی کانوں کے بارے میں پوچھا۔اسے بتایا گیا کہ اس کے لیے یہ پارہ آذربائیجان کے علاقے شیز سے آیا ہے۔اس نے اپنے مقرب اور دوست حمدون کو اس علاقے کا حاکم بنا کر بھیجا تاکہ وہ پارے کی مستقل ترسیل یقینی بنا سکے۔حمدون نے اپنے تقرر کے بعد یہ شعر پڑھا۔

ولایة الشیز عزل   والعزل عنها ولایه
فولنی العزل عنها   ان کنت بی ذاعنایه

(شیز کا تقرر حاکم کی معزولی سے بدتر ہے۔اس کی نسبت معزولی سب سے بڑا تقرر ہے۔اگر واقعی مجھ پر مہربان ہو تو مجھے اس سے معزول کر دو۔)

وہ گڑگڑاتا رہا اور واپسی کی درخواست کرتا رہا حتیٰ کہ اسے دربار میں واپس بلا لیا گیا۔

یہ تمام افعال بالآخر کمزور ہو جاتے ہیں۔خواہ وہ کتنے ہی خوش کن نظر آتے ہوں۔وہ درحقیقت تکالیف ہیں جو آرام اور راحت کی صورت اختیار کرتی ہیں۔وہ انسان کے لیے محض سبز باغ ہیں۔فطرت نے انھیں انسان کی بقا اور نوع کے تسلسل کے لیے محفوظ کر رکھا ہے۔لذات محض ایک دامِ کشش ہیں مگر احمق اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔الٰہی غرض اس امر میں یہ ہے کہ زراعت، نسل اور حیوانات کا تسلسل اس سے قائم رہے۔

انسانی جسم بدبوؤں کا مرکب ہے۔خواہ وہ صحت مند ہو تب بھی کسی بھی تبدیلی پر اس کا مونھ بدبو دینے لگتا ہے۔کثافتوں کے جمع ہونے پر ایسا ہونا لازم ہے۔اونگھنے اور خالی معدہ ہونے پر اس بدبو کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔عاشق و معشوق کی بدبوئیں ایک دوسرے کے لعاب کے ساتھ مخلوط ہو کر عجیب صورت اختیار کر جاتی ہیں۔اس موقع کے لیے ابن رومی نے کہا ہے۔

کذلک أنفاس الریاض بسحرة

تطیب و أنفاس الوری تتغیر
(باغوں سے ہوا مہکی ہوئی آتی ہے مگر انسانوں کے سانسوں سے متغیر ہو جاتی ہے)

پھر انسان پسینہ بھی خارج کرتا ہے۔اس کا سبب یا تو یہ ہے کہ ہوائی نمی کا اثر جسم پر ہوتا ہے یا پھر گرم رکھنے کے لیے بدن پر موجود بھاری لباس یا جسمانی ورزش سے پیدا ہوتا ہے۔اس لیے رفتہ رفتہ جلد کے مساموں سے پسینہ خارج ہونے لگتا ہے۔یہ اجتماع کسی انتشار کے سبب سے ہوتا ہے جو بظاہر نظر نہیں آتا۔جب پسینہ بغلوں میں جمع ہونے لگتا ہے تو اس سے بدبو پیدا ہوتی ہے۔اسی طرح ٹانگوں کے بیچ بدبو پیدا ہونے لگتی ہے۔انگلیوں کے درمیان خاص طور پر جب دستانے چڑھے ہوں بدبو آتی ہے۔بیرونی اعضا کی حرکت سے بھی جمع ہونے والے میل سے بدبو آتی ہے۔حتیٰ کہ پورے بدن سے بدبو آتی ہے۔یہ ہتھیلیوں اور تلووں کے ملنے سے گرم ہونے پر بھی پیدا ہوتی ہے۔جسم کا کوئی بھی حصہ ہو، پسینہ اور میل کسی نہ کسی صورت موجود ہوتے ہیں، خواہ وہ نظر نہ آتے ہوں۔انسان کا بہترین حصہ اس کا سر ہوتا ہے۔کسی نے ابن ابی مریم سے پوچھا کہ وہ اپنے مونھ اور سر کو عمامہ سے کیوں ڈھانپے رکھتا ہے تو اس نے جواب دیا۔

> ''میں اپنے جسم کے اس حصے کا دھیان رکھتا ہوں جس میں دنیا کے بارے میں ہر قسم کا علم جمع ہوتا ہے۔جو حواس کے ذریعے مجھے علم تک لے جاتا ہے تو اس کے حقِ زینت و آرایش کے طور پر اسے آلودہ ہونے اور درد و تکلیف سے بچاتا ہوں''۔

پسینے اور میل کو صرف دیکھنے اور چھونے سے نہیں بلکہ اس کا ذکر کرنے سے بھی کراہت آتی ہے۔بعض لوگوں کا نفسِ امارہ انھیں جنونِ عشق میں ان عیوب کو مستحسن بنا کر پیش کرتا ہے۔وہ عشق میں اندھے ہوتے ہیں۔وہ آنسوؤں میں بھی حسن دیکھتے ہیں جسے وہ بکھرے ہوئے موتیوں سے تشبیہہ دیتے ہیں۔محبّ محبوب کے لُعابِ دہن کو بھی شیریں قرار دیتا ہے اور اسے شہد اور شراب سے ملاتا ہے۔اسے محبوب کے مونھ سے مشک وعنبر کی خوشبو آتی ہے اور وہ ایک لمحے کو بھی ان چیزوں کو مکروہ نہیں سمجھتا۔وہ اس وقت تک انھیں پسند کرتا ہے جب تک کہ وہ اس کے بدن کا جز و رہتے ہیں لیکن جیسے ہی وہ بدن سے الگ ہوتے ہیں تو وہی شخص انھیں چھونے یا دیکھنے کو بھی پسند نہیں کرتا۔جب آنسو گوشۂ چشم میں پہنچتے ہیں تو گرد و غبار میں گم ہو جاتے ہیں۔جب وہ آنکھ سے بہتے ہیں تو وہ موتیوں جیسے آبدار اور شفاف ہوتے ہیں لیکن جیسے ہی وہ چشم و عارض سے دور ہوتے ہیں تو ان سے کراہت آنے لگتی ہے۔مجھے یقین ہے کہ محبوب اگر محبّ کے کھانے پر تھوک دے تو وہ اسے کھا نہ سکے گا، خاص طور پر جب اس تھوک میں بلغم بھی موجود ہو جو پھیپھڑوں اور ہوا کی نالی سے آتی ہے اور مونھ یا ناک سے خارج ہوتی ہے۔اگر کوئی اسے گوارا کر لے تو اس کا معائنہ ایسے شخص کو کرنا چاہیے جو جنونِ عشق سے محفوظ ہو۔یہ بات لاریب ثابت ہوگی کہ کوئی شخص خود اسے اس لیے گوارا کرتا ہے کہ وہ خود سے محبت کرتا ہے۔اس لیے وہ اپنی ذات سے وابستہ ہر شے سے محبت کرتا ہے۔اس کی نرگسیت اسے اپنے بارے میں اندھا کر دیتی ہے۔مثل مشہور ہے کہ کسی شے کی حد سے بڑھی ہوئی چاہت انسان کو اندھا کر دیتی ہے جس کے آگے کوئی دلیل نہیں چلتی۔اس لیے حدیثِ رسول مقبولؐ میں آیا ہے کہ کھانے کے اوپر سانس مت خارج کرو۔پس ہم دیکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا چیزوں کی حقیقت مکروہ ہے اور ان کا ظاہری حسن عارضی ہے۔عارضی شے ہمیشہ معدوم ہو جاتی ہے اور ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔

ترویحہ

انسانی زندگی کے کئی پہلو ہیں۔بعض قابلِ تعریف اور بعض قابلِ نفرت ہوتے ہیں۔اچھی چیزوں کی برتری ظاہر ہے جیسا کہ کسی

برے شخص کے برے پہلو کا ذکر اس شخص سے بھی کراہت پیدا کرتا ہے اور وہ بھی دوسروں سے جھوٹ بولتا ہے کہ اس میں یہ نقص نہیں ہے۔ وہ اچھی چیزوں کے ذکر سے خوش ہوتا ہے خواہ اس نے کوئی بھی اچھا کام نہ کیا ہو۔ وہ یہ سب کچھ خود کو بدنامی اور سزا سے بچانے کے لیے کرتا ہے۔ مستحسن افعال اور اعلیٰ صفات مروّت سے جنم لیتے ہیں اور مروّت تزکیۂ ذات اور نجابت سے پیدا ہوتی ہے۔ متموّل اسے کہتے ہیں جو دوسروں کے ساتھ فیاضی اور کریم النفسی کا سلوک کرے۔ غریب آدمی فیاضی کیوں کر دکھا سکتا ہے؟ متوسط طبقے کے فرد کا اخلاص ایک صادق اور خلیق شخص پر منحصر ہوتا ہے جو اچھے اطوار کا مالک ہو اور دونوں یک جان دو قالب ہوں۔ ایک اچھے دوست کے بارے میں مقولہ ہے کہ ''وہ تُو ہے اگرچہ وہ غیر ہے''۔ ایسے دوست ایک جیسی عادات کے مالک ہوتے ہیں اور اپنے دوست کے لیے وہی منتخب کرتے ہیں جو اپنے لیے کرتے ہیں۔ کسی شخص کے لیے دوستوں کی تعداد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ یہ تعداد فرد کی استعداد پر منحصر ہوتی ہے۔ اخلاص کی بنیاد میں احساسِ مروّت موجود ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور سچے دوستوں کی بڑی تعداد کے باوجود شعلۂ مروّت کو روشن رکھا جائے اور اسی کے ساتھ حکمرانی اور رہنمائی کی طرف پیش قدمی کی جائے۔

فرد کو خیر کا علَم بلند رکھنا چاہیے۔ اسے ہر وقت یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ اس کے لوگوں کے لیے خیر کس میں ہے، خاص طور پر اپنے قریبی ساتھیوں کے لیے۔ اسے اپنی خواہش میں منکسر اور کام میں مستعد ہونا چاہیے۔

انسان کی قریب ترین شے اس کا نفس ہوتا ہے۔ پھر وہ اشیاء ہیں جو اس کے نفسِ لوامہ اور بدن کے قریب ہوں۔ مثلاً لبادہ جو اس کے جسم کو ڈھانپتا ہے۔ اس کی بیوی جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ اس کے ملازم جو اس کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ کھانے پینے کے برتن وغیرہ۔ حسنِ صورت کا استحسان کیا جاتا ہے اور انسان اپنے ملنے جلنے والوں میں سے کسی کو محبوب بناتا ہے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے لوگوں کو وفد بنا کر بھیجتے تھے جو حسنِ صورت اور حسنِ اسماء کے حامل ہوتے تھے اور لوگوں کے ایسے نام بدل دیتے تھے جو پہاڑوں اور مقامات کے حوالے سے رکھے جاتے تھے اور ان کی جگہ اچھے اور مستحسن نام رکھتے تھے لیکن جسمانی شکل وصورت تو رحمِ مادر میں تشکیل پاتی ہے، اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ جہاں تک صورتِ نفس کا تعلق ہے مثلاً عادات اور اخلاق و سیرت وغیرہ، انھیں ضبط و تزکیہ، روحانی تربیت اور اخلاق میں بہتری اور صاحبِ ضبطِ نفس ہو کر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اسی سے کوئی شخص اپنے سقم اور برائیوں کو رفتہ رفتہ کم کر کے کتبِ اخلاق میں درج طریقوں کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ پہلی چیز جو ہمارے سامنے آتی ہے، وہ انسان کا چہرہ بشرہ ہے۔ وہ اسے تبدیل نہیں کر سکتا لیکن وہ اسے نجاستوں سے پاک رکھ سکتا ہے۔ انسان کو بے نطق حیوانات سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ بلی کو دیکھیں۔ جب یہ انسان کے ساتھ رہنا شروع ہوتی ہے تو وہ گھر اور فرش کو اپنی غلاظت سے پاک رکھتی ہے اور بول و براز کے لیے خاص جگہ منتخب کر لیتی ہیں جس طرح کہ انسان بیت الخلا بنا لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ امرِ الٰہی کی پابندی کرتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> ''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ تو اپنے مونھ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولیا کرو اور سر پر ہلکا سا مسح کر لو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھولیا کرو''۔ (المائدہ ۶:۵)

ذرا ملاحظہ کریں کہ بلی اپنی صفائی اور پاکیزگی کے بارے میں کتنی حساس ہے اور اپنے بول و براز کو کس طرح مٹی سے ڈھانپ دیتی ہے تاکہ کوئی بدبو پیدا نہ ہو اور اپنے اعضاء کو اسی طرح سے چاٹتی ہے جیسے انسان وضو کرتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کو چاٹ کر اور اپنی ناک کو نیچے سے رگڑ کر صاف کرتی ہے۔ وہ اسی طرح اپنے نتھنے صاف کرتی ہے جیسے انسان انگلی سے کرتا ہے۔ پھر وہ غرارے کرتی ہے اور ایسی حرکات کرتی ہے گویا وہ ناک کو پانی سے دھو رہی ہو۔ وہ اپنی ہتھیلیوں کو اپنے لعاب سے نم دار کرتی ہے اور آہستگی سے اپنے کان ملتی ہے۔

انسان کی طہارت کا انحصار ایسے پانی پر ہے جس کی بو اور خالص پن روح اور نفس کے لیے پسندیدہ ہو اور لطفِ حیات چکھاتا ہو۔ وہ صفائی کا کام کیونکر کرسکتا ہے جو خود ہی گنوار اور دیکھنے میں بُرا ہو؟ شریعت کی رُو سے ایسا صرف صاف ستھرے پانی یا اس کے متبادل کے ذریعے سے ہوسکتا ہے۔ عرب مرد و زن اپنی بیٹیوں کو رخصتی کے وقت جو وصیت کرتے ہیں وہ اسی واحد نقطے پر مرکوز ہوتی ہے۔ عبداللہؓ بن جعفر بن ابی طالب سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنی بیٹی کی رخصتی کے وقت فرمایا:

''زیادہ انا پرستی نہ دکھانا کہ یہ طلاق کی کنجی ہے۔ زیادہ اشتعال کبھی نہ دکھانا کہ اس سے بغض جنم لیتا ہے۔ زینت کے لیے اپنے بیرونی لبادے پر توجہ دینا۔ زینت کو بہتر کرنے کی چیز سرمہ اور خوشبوؤں سے محبت ہے اور بہترین خوشبو پانی کی خوشبو ہے''۔

عامر بن ظرب عدوانی نے اپنی بیٹی کو اپنے بھتیجے کے ساتھ بیاہتے وقت اپنی بیوی سے کہا:

''بیٹی کو ہدایت کرو کہ جب بھی وہ جنگل کو (رفع حاجت کے لیے) جائے تو پانی ساتھ لے کر جائے کیونکہ پانی بالائی جسم کے لیے زینت اور نچلے دھڑ کے لیے صفائی کا ذریعہ ہے۔ شہوت کے وقت شوہر کی موافقت کرے۔ خوش قسمتی خود کو سپرد کرنے اور اتصال میں ہے۔ شوہر کے ساتھ زیادہ نہ سوئے کیونکہ بدن کے مغلوب ہونے کے ساتھ دل بھی مغلوب ہوتا ہے''۔

ایک عرب فلسفی نے اپنے بیٹی کو حجلۂ عروسی میں جاتے ہوئے نصیحت کی:

''اپنے شوہر کی کنیز بن کر رہنا تاکہ وہ تمھارا غلام بنے۔ اس کے ساتھ نرم خو رہنا کیونکہ نرم خوئی جادو سے زیادہ اثر کرتی ہے۔ پانی استعمال کرنا کیونکہ پانی تمام خوشبوؤں کا سرتاج ہے''۔

ایک عورت نے اپنی بیٹی کو یہ نصیحت کی:

''اپنے شوہر کے لیے بستر بن جاؤ تاکہ وہ تمھارے لیے نان و نفقہ کا ذریعہ بنے۔ جب وہ خوش ہو تو اداسی کو کچل دو اور جب وہ پژمردہ ہو تو اسے خوش کرو۔ وہ تم میں کوئی برائی نہ دیکھے اور تمھارے بدن سے اسے خوشبو آئے۔ اس کے راز کبھی فاش نہ کرو۔ اس کی نگاہوں میں بلند ہو کر رہو۔ پانی، تیل اور سرمہ استعمال کرو کہ وہ اچھی خوشبویات ہیں''۔

ایک اور عورت نے اپنی بیٹی سے کہا:

''اپنے بدن کو خوشبو اور روغن سے آراستہ کرو۔ اپنے شوہر کی تابع فرمان رہو اور خوشبویات میں سے پانی کا استعمال زیادہ رکھو''۔

ایک اور نے یہ نصیحت کی:

''خود کو ڈھانپو، اپنے شوہر کا لحاظ رکھو اور پانی کو خوشبو کے طور پر استعمال کرو''۔

ایک اور نے بھی ایسا ہی کہا:

''نہ تو اپنے شوہر کی ہر بات ماننا اور نہ زیادہ نافرمان ہونا۔ کہیں وہ دل برداشتہ نہ ہو جائے۔ اس سے مخلص رہنا اور پانی کو خوشبو کے طور پر استعمال کرنا''۔

یہاں جو کچھ کہا گیا ہے ضروری اور لازم ہے لیکن مونْہ ہاتھ دھونے اور جسم کو چمکانے اور پانی سے دھونے کے بعد انسان کو چاہیے کہ اپنے چہرے کو ایسے رنگ سے زینت بخشے جو روشنی میں نظر آئیں۔ جسم کو پاؤڈر اور خوشبویات سے آراستہ کیا جا سکتا ہے، خاص طور پر جب چہرے پر قدرتی یا مصنوعی زردی موجود ہو۔ دانتوں کو مسواک وغیرہ سے صاف کیا جا سکتا ہے۔ آنکھوں اور پلکوں کو صاف رکھا جائے اور انھیں سرمہ وغیرہ سے آراستہ کرنا چاہیے۔ حسبِ خواہش بالوں کو رنگا اور گھنگھریالا بنایا جا سکتا ہے اور ان میں کنگھی کرنی چاہیے۔ ناخنوں کی خوبصورتی ان کی باقاعدہ تراش میں ہے۔

اب ان اشیاء کا ذکر جو جسم کے ساتھ چپکی رہتی ہیں۔ ان میں سب سے پہلے کپڑے ہیں جو جسم کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ لازم ہے کہ جسم کو صاف ستھرا رکھا جائے تا کہ ان پر گرد وغیرہ جمع نہ ہو۔ موسم اور وقت کے حوالے سے کپڑے پہنے جائیں اور ان کے رنگ موقع محل کی مناسبت سے ہوں تا کہ جسمانی عیوب ونقائص ان سے چھپ جائیں۔ ان کو مزید آراستہ کرنے کے لیے پتھر اور جواہر استعمال کیے جائیں جو اسی مقصد کے لیے تخلیق ہوئے ہیں۔ حضرت عمرؓ (ابن خطاب) سے پوچھا گیا کہ مروّت کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ یہ لباس کی صفائی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ظاہری مروّت لباس کی خوش نمائی میں ہے۔ یہ صحیح ہے کیونکہ ہر وہ شخص جو طہارت پسند ہے پہلے جسمانی طہارت پر توجہ دیتا ہے تا کہ لباس پر جسمانی غلاظتیں جمع نہ ہوں۔ پھر وہ اپنی حرکات پر متوجہ ہوتا ہے۔ پھر گھر کی صفائی تا کہ وہاں موجود گرد سے کپڑے خراب نہ ہوں۔ آپ خود ملاحظہ کریں کہ پوشاک کی صفائی سے ہر چیز کیسے صاف ستھری ہو جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ان کے لیے کافی ہیں جو اپنی ذاتی طہارت کے لیے احتیاط نہیں برتتے ۔

لا یلیق الغنی بوجہ ابی الفتح ولا نوربہجتہ الاسلام
وسخ الثوب و العمامہ و البرذون والوجہ والقفا والغلام

(ابوالفتح کے لیے نہ تو طاقت نہ نورِ اسلام موزوں ہے (بلکہ) گندے کپڑے، عمامہ اور مکروہ گدھا، میلا کچیلا حلیہ،
آلودہ گردن اور اس کے ہمراہ ایک گندہ غلام)

لباس کی صفائی اور تازگی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ نفس اور قلب، لباس، کرتہ، پاجامہ کی صفائی ہی اخلاص کی بنیاد ہیں۔ بعض مفسرین نے اس آیت (وثیابک فطہر (المدثر ۷۴:۵)) کے بارے میں کہا ہے کہ تنفر اور کراہت کی طہارت میں تزکیۂ قلب اور نیت کی صفائی مقصود ہے۔ ایسی تفسیر ممکن ہے۔ ایسا ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ آیت میں ظاہر و باطن دونوں کے بارے میں بات کی گئی ہو۔ عقل کی رُو سے دونوں کا امکان ہے۔ یہ مروّت کی ادنیٰ ترین صورت ہے۔ بعض کے نزدیک مروّت حُبِّ ریاست یا مدبّری ہے۔ کیونکہ مدبّر بے حد سنجیدگی اور شائستگی سے ہمرشتہ ہے۔ لیکن یہ فتوت ہے مروّت نہیں۔ کسی نابغہ کا کلام ہے ۔

رقاق النعال طیب حجزاتہم
یحیون بالریحان یوم السباسب

(وہ مقدس اور مطہر ہیں۔ سباسب (عید) کے روز انھیں ریحان کی دھونی دی جاتی ہے)

روزِ سباسب کو یومِ شعانین بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ شعر غسان کے حکمرانوں کے بارے میں ہے۔ غسان کے حکمران عیسائی تھے۔ غالبًا وہ ریحان کی دھونی کو اہمیت اس لیے دیتے تھے کہ جب یسوع مسیح کے ساتھ بیت المقدس میں آنے والے لوگ گلگل اور زیتون سے ہاتھوں پر مسح کرتے تھے۔ یہ کوئی موزوں مفروضہ نہیں۔ لیکن اس شعر کا مقصود پھولوں کی اہمیت اجاگر کرنا ہے۔ جب غسان کے شہزادے صحرائی راستوں

پر سفر کرتے تھے تو لوگ ان پر پھولوں کی پھوار (دھونی) پھینکتے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ پھول صحراؤں کے لیے نہیں ہوتے لیکن اس علاقے میں لوگ پھولوں سے پیچھے نہیں رہتے تھے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب سلاطین اور امراء صبح کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو پھول اور سبزیاں ان کے ہمراہ کر دی جاتی ہیں۔ ہر چیز جو نادر ہوتی ہے بطور علامت استعمال ہوتی ہے۔ بکر بن النطاح حنفی کا قول ہے ۔

جـــئتک بـــــالـــــرامـــــش رامشـــــة
أطيـــــب مـــــن را مشـــــة الآس
(میں تمھارے لیے ایسا گلدستہ لایا ہوں جو گلِ حنا کی شاخ سے بہتر ہے)

شاعر نے صرف رامشۃ کا لفظ استعمال کیا ہے جو ایسے جڑواں پتوں کو ظاہر کرتا ہے جو درمیان سے جڑے ہوں اور آخر میں منتشر ہوں جیسا کہ مہندی کے پتے ہوتے ہیں۔ ایسے پتے شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے جب بڑوں کو مبارکباد دی جاتی ہے تو ایسے پتے ہاتھوں میں پکڑ کرلائے جاتے ہیں، خاص طور پر دیلم کی مبارکباد کے لیے۔

لباس کے بعد زیب و زینت کے لیے جواہر کی باری آتی ہے۔ ہر ملک کے رسوم و رواج مختلف ہوتے ہیں۔ ہر قوم انگوٹھی، تاج، ہار، طرہ، ٹوپی، پگڑی، دستانوں وغیرہ کے لیے اور درباریوں کی لاٹھی اور عصا میں استعمال کے لیے جواہرات کا مختلف طریقے سے استعمال کرتی ہے۔

جواہرات کانوں کے بُندوں، مکٹ/تاج، کنگھی/شانہ، لباس کنگن، چوڑیوں، باز و بند، ہار اور عورتوں کے گلوبند وغیرہ میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ کچھ شوقین جواہرات کو ایسی چیزوں میں بھی استعمال کرتے ہیں جو جسم سے دور ہوتی ہیں۔ مثلاً دیواریں، چھت، دروازے، روشن دان وغیرہ جنھیں وہ خوب سجاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے کہ گھر میں آنے والا شخص پہلی نظر میں مرعوب ہو جائے۔ ان چیزوں سے دولت اور امارت ظاہر ہوتی ہے لیکن یہ سب کچھ حقیقت سے بعید ہے اور اس میں صاف طور پر فخر و غرور ہی نظر آتا ہے۔

ترویحہ

اخلاص کے بعد مروّت کی تکمیل کا سب سے اہم پہلو خوشبویات ہیں۔ خوشبویات دوسروں کو قرب کے لیے ملتفت کرتی ہیں۔ ان سے عیوب اور نقائص کی پردہ داری ہو جاتی ہے۔ مروّت کی تعریف کا واسطہ خاص طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ جب کوئی دوسروں کے لیے وہی منتخب کرے جو اپنے لیے کرتا ہے تو اس بات کا تعلق امر و نہی سے ہے۔ ایک اور شخص نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ مروّت مناعی اور تکالیف سے دور رہنے کا نام ہے۔ درحقیقت مروّت ایمان کے راستے پر ثابت قدم رہنے کا نام ہے کیونکہ ایمان انصاف اور مساوات کا طالب ہوتا ہے۔ یہ ظلم کا مکمل استیصال چاہتا ہے کیونکہ ظلم خود غرضی سے جنم لیتا ہے اور مظلوم کی دستگیری مطلوب ہے۔ یہی معنی مروّت میں پوشیدہ ہیں یعنی انسان وہ کام چپکے سے بھی نہ کرے جو کھلم کھلا نہ کر سکے۔ جس نے اپنے افعال کو شرافت سے احسن بنالیا اور اپنا رزق حلال آمدنی سے کمایا اور اپنے دسترخوان پر دوسروں کو شریک کیا اور خود کو تزکیۂ ذات کے لیے وقف کیا اور اپنی ذات کو خوشبویات سے مزّین کیا جنھیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی پسند فرمایا ہے، اپنے شریکِ دسترخواں کو خوش کیا، اسے اپنے قریب کیا، اسے عزت دی، اسے ابتلا سے محفوظ کیا، اپنے لیے وہی منتخب کیا جو دوسروں کے لیے چاہے، کنجوسوں کے گروہ میں شامل نہیں ہوا جو تنہا کھاتے اور اپنے غلاموں کو مارتے ہیں۔

اگر ۱۰۷ویں سورۃ کی پانچویں آیت میں ''شیاب'' کا مفہوم انسان کی نیت اور داخلی فطرت ہے تو تزکیۂ ذات فرد کو تسلیم و رضا، قناعت، عملِ صالح اور ایسے اعمال کی دعوت دیتا ہے جو صرف اسی دنیا ہی میں نہیں آخرت کا توشہ بھی ہیں۔

معزالدولہ ابن احمد بن بویہ ایک غالی شیعہ تھا۔ اس نے نواحِ فارس سے ایک شخص کو بلا بھیجا جو حضرت علیؓ کی نسل سے تھا۔ یہ معزز شخصیت اپنے کردار، دیانت اور سنجیدگی کے حوالے سے معروف تھی۔ معزالدولہ نے عباسی خلیفہ مطیع باللہ کے بارے میں کہا کہ وہ ناکارہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ چاہتا ہے کہ حقدار کو اس کا حق ملے۔ معزالدولہ نے مزید کہا کہ اس نے اس فاضل اجل کے سامنے یہ مطالبہ کیا کہ اس کے ذریعے خلافت اور حکومت حقداروں کے پاس چلی جائے گی۔ وہ امت کی ذمہ داریاں بہتر طور پر نبھا سکتا ہے کیونکہ اللہ نے اس میں فضل، عدل اور حسنِ عمل جمع کر دیے ہیں۔

اس فاضل اجل علوی نے معزالدولہ کا شکریہ ادا کیا اور اس حسنِ اعتقاد کے بارے میں اس کی تعریف کی جو وہ اہل بیتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ بتولؓ کی اولاد کے بارے میں رکھتا ہے اور تقربِ الٰہی کے لیے کوشاں ہے اور پھر اس نے اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت مانگی۔ اجازت پانے پر وہ یوں گویا ہوا:

''اسلامی سلطنت کے عوام نے عباسی دعوت پر لبیک کہا۔ انھوں نے اس کی اطاعت اسی طرح کی جیسے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی کرتے تھے۔ انھوں نے ان کا امر تسلیم کیا اور ان کے مقرر کردہ حاکموں اور امیروں کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں خیر کا منبع مانا۔ انھوں نے علویوں کو قید اور قتل کیا اور یقیناً انھوں نے ایسا اس لیے کیا کہ وہ عباسیوں کے باغی تھے جو زمین پر اللہ کے نائب تھے اور یوں وہ حق اور راستی کے مخالف ٹھہرے۔ اگر آپ عمل کے اندر اپنی نیت شامل کر لیں اور وہی کریں جو دل میں ہے تو آپ دیکھیں گے کہ عوام اپنے مزاج کے خلاف عمل کریں گے۔ وہ آپ کو فوراً تسلیم نہیں کریں گے اور وہ جن کے ذریعے آپ خلیفہ کو پچھاڑ دیں گے، آپ سے حسد کرنے لگیں گے، اگرچہ بظاہر وہ آپ کی خلافت کو تسلیم کر لیں گے۔ چنانچہ آپ محض خلافت کو ایک قبیلے سے دوسرے میں منتقل کرنے کا باعث ہوں گے اور آپ اس خون ریز جدوجہد سے رنجیدہ اور کبیدہ خاطر ہوں گے اور اس سارے عمل کا سبب میری ذات ہوگی۔ میں آپ کے نزدیک بہت برا ثابت ہوں گا۔ آپ اپنے کیے پر پچھتائیں گے اور مجھے دکھ اور تکلیف پہنچے گی۔ ایسا آپ کے فتحیاب ہونے پر ہوگا اور اگر خدانخواستہ آپ ناکام ہوئے تو آپ اپنی سلطنت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور میں اس وقت امن و سکون میں نہ ہوں گا جب تک کہ میں دارالاسلام میں رہوں گا اور تب مجھے فرار ہو کر دارالحرب میں بت پرستوں کے ساتھ مل جانا ہوگا۔ چنانچہ آپ کیوں کر خود کو اس جہد کے لیے آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں آپ کی جناب میں عرض گزار ہوں کہ میں اس عزت و توقیر پر خوش اور قانع ہوں جو مجھے طول و عرض میں حاصل ہے۔ لوگ مجھ سے دعا لیتے ہیں۔ کوئی حاکم یا امیر اس دستگیری سے برتر نہیں جو قدرت نے مجھے عطا کر رکھی ہے۔ از راہ کرم مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں تا کہ میں بھی زندگی کو اسی طرح خوشی سے گزار سکوں جس طرح کہ آپ اپنی سلطنت کے ثمرات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ حکمران ہونے کے باوجود آپ میری آستین بوسی کو عار نہیں سمجھتے جو ان گندے ہونٹوں، پیلے دانتوں اور بدبودار سانسوں سے کہیں زیادہ پاک صاف ہے۔ جن سے آپ ہر رات لطف اندوز ہوتے ہیں اور جن کی بوسیدگی آپ کو متنفر نہیں کرتی۔ اللہ

سے دعا کریں کہ وہ آپ کو صراطِ مستقیم دکھائے اور دنیا و آخرت کی خوشیاں اور ایمان کی سلامتی عطا کرے۔ میری دعاؤں کو توشۂ آخرت سمجھیں''۔

معزالدولہ نے اس فاضل اجل کی یہ تقریر بڑی توجہ سے سُنی اور اس کی عزت اس کے دل میں بڑھ گئی۔ وہ روتا ہوا اٹھا۔ اس کے سر آنکھوں کو چوما اور اسے بڑی عزت کے ساتھ گھر بھیج دیا۔ اس واقعے پر کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ۔

اذا کنت فی نعمة فارعها
فان المعاصی تزیل النعم
(اپنی نعمتوں کی اسی طرح حفاظت کرو جیسے گناہ نعمتوں کو زوال دیتے ہیں)

آپ دنیا اور آخرت کی نجات اس شعر کے مفہوم پر عمل پیرا ہو کر حاصل کر سکتے ہیں۔ نعمتیں پانے والے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ اور اللہ کی نعمتوں پر خوش رہتے ہیں۔

ترویجہ

تمام انسانوں کا جدامجد ایک ہے۔ وہ سب ایک سی جسمانی ساخت کے مالک ہیں لیکن ایکدوسرے کے ساتھ حسد اور خصومت کے باعث مختلف ہو جاتے ہیں۔ یہ بات انسانی فطرت میں ہے کہ سب انسان مزاج اور عادات کے لحاظ سے مختلف ہوں۔ آدم کے زمانے سے یہی طریق چلا آ رہا ہے کہ ایک کی قربانی قبول کر لی جاتی ہے اور دوسرے کی نہیں۔ کیا خدایا حکمرانوں کا خوف ہی انسانوں کو ایک دوسرے کے جان و مال پر قابض ہونے سے روک سکتا ہے۔

جب بادشاہ اپنے حکم، لفظ اور وعدے پر صادق نہ ہو تو اسے سیاسی طور پر قائم رہنے کا حق نہیں رہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ حکمرانی بعض قبائل تک نہیں بلکہ خاندانوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے بلکہ صرف خاندان تک ہی نہیں بلکہ ایسے افرادِ خاندان تک سکڑ جاتی ہے جو دوسروں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے یہ ان کے خاندان میں آ جاتی ہے، خاص طور پر وارثوں میں اور یوں ملک ان کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ تائیدِ ایزدی اور حکمِ الٰہی یہی ہے کہ ایک خاص خاندان کے افراد کو حقِ حکمرانی دیا جائے جیسا کہ بادشاہانِ فارس اور قریش میں خلافت اور امامت کا حق یا پھر ایسے افراد کے لیے جن کی محبت اور الفت مسلمانوں کے لیے فی سبیل اللہ یا پھر تبت کے لوگوں میں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خاقان اول سورج کا بیٹا تھا اور دنیا کی ابتری کو دور کرنے کے لیے زمین پر آیا۔ یا دورِ جہالت میں کابل کے لوگوں کا معاملہ جن کا عقیدہ ہے کہ برہمگین تر کی غار میں پیدا ہوا تھا۔ اسے آج بغرا کا نام دیا جاتا ہے اور وہ اس سے باہر تاجِ شاہی پہنے ہوئے نکلا تھا۔ اس قسم کی کئی روایات موجود ہیں جن میں ''رضائے الٰہی'' کو رواج دیا گیا تاکہ دوسروں کے ذہنوں میں بادشاہی کے خواب پیدا نہ ہوں اور وہ بادشاہوں کی خدمت کرتے رہیں۔

چونکہ بادشاہوں کو یہ خطاب حاصل ہوئے تھے، اس لیے انھوں نے خود کو اس کے شایانِ شان بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے بڑے بڑے دربار اور قلعے تعمیر کرائے اور عظیم تاج و تخت بنوائے تاکہ وہ آسمانی مخلوق محسوس ہوں اور انسانوں کو ذرا بلندی سے دیکھ سکیں۔ شاعر بُحتری نے کیا خوب کہا ہے۔ ۹

ولیس للبدر الاماحبیت به
ان یستنیر وان تعلو منازله

(جو کچھ تجھے عطا ہوا وہی بدر کو عطا ہوا ہے تا کہ تو اعلیٰ منزلوں اور آب و تاب کو چھو لے)

انھیں اپنی عظمت ظاہر کرنے کا کوئی اور طریقہ نظر نہیں آتا سوائے اس کے کہ وہ بڑے بڑے تخت اور تاج بنوائیں اور اپنے دست اتنے دراز کریں کہ وہ ستاروں کو چھو لیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں نے اپنے ایک بادشاہ کا نام ''مہابا ہو'' رکھ دیا تھا یعنی ''لمبے ہاتھوں والا''۔ اہل فارس نے ''ریوند دست'' کا لقب بہمن اردشیر کو دیا تھا۔ ''ریوند'' کے معنی فارسی میں ''ریباس'' کی جڑوں کے ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ جب تک وہ پانی کی گہرائیوں تک نہ پہنچ جائیں، پودا باہر نہیں نکلتا، خواہ وہ پہاڑ کی چوٹی پر اُگ رہا ہو۔ یہ تمام باتیں دراصل علوہمتی اور وسعتِ قدرت کو ظاہر کرتی ہیں۔

بادشاہ اپنی زیب و زینت کے لیے جن سے ان کے عوام کے دلوں میں ہیبت اور رعب طاری ہو، ایسی قیمتی چیزیں استعمال کرتے تھے جن سے وہ حیرت میں مبتلا ہوں اور انھیں حسرت سے دیکھیں۔ اس کے لیے وہ عجیب و غریب کام انجام دیتے تھے۔ چنانچہ وہ شرافت و مودّت کے انوکھے انداز وضع کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے سفارت کے طریقوں میں کشتیاں، گھوڑے، کبوتر وغیرہ استعمال کیے تا کہ ان کے احکامات اور پیغامات کم سے کم وقت میں پہنچ سکیں۔ لوگ ظاہر و باطن میں ان سے ڈرنے لگے اور خیانتوں اور حکم عدولیوں سے اجتناب کرنے لگے۔ ایسے ظالم بادشاہوں کے قصے بہت ہیں۔

ترویجہ

دولت کے زیادہ حریص افراد بادشاہ ہوتے ہیں کیونکہ دولت کے ذریعے وہ تسلط کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ خلیفہ منصور نے اپنے محافظ یا حاجب ربیع کو بتایا:

''ربیع! میں دولت جمع کرتا ہوں۔ لوگ مجھے بند مٹھی والا سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اللہ نے اس مذموم عادت سے دور رکھا ہے۔ لیکن میں نے لوگوں کو دینار اور درہم کے بندے پایا ہے۔ میں نے ان کے ذریعے انھیں اپنا مطیع بنایا ہے۔ یہی باعث ہے کہ دینار اور درہم میرے پاس جمع ہوتے ہیں اور میں انھیں لوگوں میں تقسیم کرتا ہوں، جب بھی انھیں ان کی ضرورت ہو۔ یہ حقیقت واضح ہونی چاہیے کہ میں نہ تو ان کو ذخیرہ کرتا ہوں، نہ خزانے جمع کرتا ہوں لیکن یہ پانی کی آبشار کی طرح نیچے کو بہتے ہیں۔ کئی مونھ کھلے ہوتے ہیں اور کئی ہاتھ جھپٹتے ہیں، انھیں بطور عطیہ یا معاوضے کے طور پر نگلنے کے لیے اور کئی آنکھیں پہلی کا چاند دیکھنے کی طرح انعامات اور تحفوں کی بارشوں کے انتظار میں گڑی ہوتی ہیں اور کئی انگلیاں کھاتوں میں ادھار لکھوانے کی منتظر ہوتی ہیں''۔

یہی وجہ ہے کہ بادشاہ اور سلاطین اپنی دولت کے لٹنے کے خوف میں مبتلا ہوتے ہیں جس سے یہ سلسلہ ختم ہو سکتا ہے۔ ہر مجموعہ منتشر ہونے کے لیے ہوتا ہے اور ہر منتشر ہونے والی شے معدوم ہو جاتی ہے۔

امیر مرحوم یمین الدولہ محمود رحمت اللہ علیہ کی ایک پختہ عادت مجھے یاد ہے کہ جس نے شکار کا جانور منتخب کیا اور اسے شکار کرتا گیا۔ وہ اپنے شکار کی تلاش میں وادی وادی پھرا۔ خوارزم سے ایک بار واپسی کے وقت وہ بڑا رنجیدہ سا ہو کر بولا:

''منجموں نے مجھے بتایا کہ میری زندگی کے کوئی دس سال رہ گئے ہیں............ میں نے اپنے قلعوں کو ہر طرح کی دولت سے بھر دیا ہے۔ جو اگر میرے باقی دنوں کے لحاظ سے لوگوں میں صرف کی جائے تو کافی ہو گی خواہ ہاتھ کتنا ہی

کشادہ رکھا جائے''۔

یہ سن کر میں بیحد ملول ہوا اور جس بارے میں وہ ہمیشہ شاکی رہا کہ میں غلط بات کرتا ہوں، میں نے کہا:

''خدا کا شکر ادا کرو۔ اس کا ذکر کرو اور اس سے اپنے خزانے کے محفوظ ہونے کی دعا کرو۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری شہرت اور حکومت کسی نقصان سے دور رہے کہ یہ خزانے انھی کے باعث جمع ہوئے ہیں اور کوئی بھی دن انھیں نقصان پہنچانے والا نہ گزرے''۔

یہ سن کر اس کی بے چینی ختم ہوگئی۔ میری یہ نصیحت ان کے لیے بھی ایک سبق ہے جو عبرت پکڑتے ہیں۔ امیر مسعود شہید کی قسمت کا حال دیکھیں۔ (خدا اس کے درجات بلند کرے)۔ جب اسے شہید کیا گیا، اس کی حکومت زوال کا شکار ہوئی اور اس نے جو دولت جمع کی تھی خواہ وراثت سے یا کسی طرح حاصل کی گئی تھی، ہواؤں میں بکھر گئی۔ یومِ دخان کے موقع پر قبیلہ عاد نے جو جمع جتھا کر رکھا تھا، دھوئیں میں اڑ گیا۔ یہ ہے قسمت کا کھیل یا امرِ الٰہی کا جبر۔

ترویجہ

زمین کے دفینے بطنِ ارض میں بیکار پڑے رہتے ہیں۔ عام طور پر یہ خزانے جو مخالف گروہوں سے متعلق ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے سے اتنے ہی مختلف ہیں جتنی کہ دو چیزیں ہوسکتی ہیں۔ یعنی سلاطین اور مساکین۔ مساکین اپنی رقم اور متعلقہ اشیا زمین میں اس خیال سے گاڑ دیتے ہیں کہ وہ مانگنے سے بچے رہیں گے اور ان کا یہ ذخیرہ قوت بن کر قائم رہے گا۔ یہ بات فقرا کے سلسلے میں درست ہے جو بڑی لجاجت اور شدت سے مانگتے ہیں۔ ان کے پاس سامان اکل و شرب خریدنے کے لیے پیسہ نہیں ہوتا، اس لیے وہ دولت، تحائف، جواہر جمع کرنے اور ان کے انبار لگانے میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ چھوٹے سکوں کے بدلے میں بڑے سکے لیتے ہیں اور انھیں اشرفیوں میں بدلوا لیتے ہیں۔ ان کا کوئی امین نہیں ہوتا سوائے زمین کے جو ان کی امانتیں انھیں لوٹا سکتی ہے۔ اس لیے زمین کا یہ اعتبار ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا ہے اور ہر امانتدار شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ زمین سے بڑھ کر معتبر ہے۔ اکثر فقیر فاقوں کے ہاتھوں مرجاتے ہیں کیونکہ وہ خود پر سختی کرتے ہیں اور خوراک کے حوالے سے سخت ایام میں بھی دولت جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ انھوں نے جو کمایا ہے وہ ان کی بدقسمتی کے باعث دوسروں کے پاس چلا جائے یا وہ کسی دوسرے کے لیے اسے وصیت کریں۔ بہرحال وہ خزانہ چھوٹا ہو یا بڑا زمین میں مدفون رہ جاتا ہے۔

جہاں تک بادشاہوں کا تعلق ہے وہ بھی اکثر خزانے زمین میں دفن کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے قلعوں اور محلوں میں جواہر اور دولت دفن کرتے رہتے ہیں اور وقتاً فوقتاً انھیں اس طرح سے حرکت میں لاتے رہتے ہیں تا کہ یہ جاننا ناممکن ہو جائے کہ خزانے کہاں مدفون ہیں۔ وہ خفیہ جگہیں تاڑتے رہتے ہیں جو کسی دوسرے شخص کے علم میں نہ ہوں۔ ایسے بادشاہ بھی ہیں جنھوں نے ان لوگوں سے ان جگہوں کو نہیں چھپایا جو یہ دولت منتقل کرتے اور یوں خدا پر بھروسا رکھتے ہیں۔ بعض بادشاہ انھیں مزدوروں سے چھپاتے اور ہر قسم کی تدبیریں کرتے ہیں۔ مثلاً مزدوروں کو مدفن کی طرف رات کے وقت صندوقوں میں لے جایا جاتا ہے۔ رات ہی کو وہاں کام کیا جاتا ہے اور انھیں رات ہی کو صندوقوں میں واپس لایا جاتا ہے تا کہ وہ خزانے کے مدفن کا مقام نہ جان سکیں۔ اس تدبیر کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انھی مزدوروں کو دوبارہ وہاں نہیں لایا جاتا تا کہ وہ مدفن کی جگہ دیکھنے کے لیے بیتاب نہ ہوں۔ اس طرح ان کے مقاصد پورے ہو جاتے ہیں اور ان کا پتا چل جانے کا خدشہ دور ہو جاتا

ہے۔ایک بادشاہ اس نقل وحمل کے بارے میں زیادہ محتاط نہیں تھا۔دفینے کے نگران نے صندوق میں سوراخ کررکھا تھا۔اس نے اپنے پاس چاولوں کا تھیلا رکھا ہوا تھا اور وہ راستے بھر چاول کے دانے بکھیرتا آیا۔اگلی صبح وہ اس جگہ پر پہنچا جہاں خزانہ دفن کیا گیا تھا اور اسے نکال لیا۔بادشاہ کو اس کا پتا نہ چلا۔اسے بیس سال بعد اس کی ضرورت پڑی تو وہاں کچھ نہ تھا۔

یہ خزانے اسی طرح پڑے رہتے ہیں۔بعض اوقات اتفاقاً لوگوں کو دفینے کے بارے میں پتا چلتا ہے جب وہاں سیلاب یا دیگر قدرتی آفات آتی ہیں۔بجکم ماکانی نے بڑی محنت اور محبت سے اپنا خزانہ جمع کیا تھا اور ایک کرد کے نیزے سے اس کے مارے جانے کے باعث وہ زمین ہی میں رہ گیا۔اسی طرح ابوعلی محمد بن الیاس کے خزانے کرمان کے صحرا میں مدفون ہی رہ گئے جب اسے اپنے بیٹے کے ہاتھوں صغد کی طرف بھاگنا پڑا۔کسی نے سچ کہا ہے "آرام میں رہنے والوں کو بہت سختی اٹھانا پڑتی ہے"۔

ترویجہ

چونکہ بادشاہ اور حکمران اکثر اپنی مرضی سے یا اضطراری طور پر سفر میں رہتے ہیں،اس لیے انھیں اپنا خزانہ اپنے ساتھ رکھنا ہوتا ہے تاکہ خدام وحشام کے اخراجات پورے ہوسکیں اور وہ سفر کے دوران میں اخراجات کے ہاتھوں محتاج نہ ہوں۔چاندی اگرچہ وزن میں ہلکی ہے مگر متعلقہ اشیا کی قیمت ادا کرنے کے لیے وزن رکھتی ہے لیکن انھیں کوئی اور قیمتی شے درکار ہوتی ہے،اس لیے انھوں نے سونا رکھنے کا فیصلہ کیا جو چاندی سے دس گنا قیمتی ہے۔ازمنۂ قدیم میں خون بہا اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے سونے کو چاندی سے دس گنا زیادہ قیمتی ٹھہرایا گیا۔یہ قدر بعد کے ادوار میں قائم نہ رہ سکی،بعض اوقات اس کی کمیابی اور بعض اوقات چاندی کی نسبت افراط وتفریط کی صورت میں اور چاندی کی تانبے کی نسبت کمیابی کے باعث۔

حیرت کی بات ہے کہ یہ تینوں دھاتیں زرویان کی کانوں سے نکالی جاتی ہیں لیکن ان کی باہمی نسبت یہی قائم ہے۔اگر سونا دس درہم وزن میں ہو تو چاندی پچاس درہم اور تانبا پندرہ سیر۔

چاندی اپنے ساتھ رکھنا آسان ہے۔اسی لیے بادشاہ اور سلاطین سفر میں اسے اپنا ساتھی بناتے ہیں۔ان کا مشاہدہ ہے کہ جب کبھی انھیں ان دیکھی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تو ان کی نجات اس شے میں ہوتی ہے جو وزن اور مقدار میں کم ہو۔اس لیے وہ جواہرات پر انحصار کرتے ہیں جو حجم میں سونے سے کم ہوتے ہیں،جس طرح کہ سونا حجم میں چاندی سے کم اور یہ سب ان چیزوں سے حجم میں کم ہوتی ہیں جو ان سے خریدی جاتی ہیں۔اس لیے انھوں نے یہ چیزیں جمع کرنا اور اپنے بدن پر پہننا شروع کیں اور جب انھیں روپوش ہونا پڑتا ہے تو وہ اپنے دشمن سے پوشیدہ ہوسکتے ہیں جس طرح کہ اصحاب کہف ہوئے تھے۔ان کے پاس جو سکے تھے وہ پرانے ہوگئے تھے،اس لیے لوگوں کو خیال گزرا کہ انھیں کوئی پرانا خزانہ ملا ہے۔حقیقت میں جواہرات بادشاہوں اور سلطانوں کا خاصہ سمجھے جاتے ہیں۔اگر جواہرات ایسے شخص کے پاس پائے جاتے جو نہ تو بادشاہ ہوتا اور نہ امیر تو وہ لوگوں میں مشکوک ہوجاتا اور انھیں یقین ہوتا کہ جواہرات چرائے گئے ہیں اور ہر فرد چور کو گرفتار کرنے کا شائق ہوتا ہے۔یا پھر وہ یہ یقین کرنے پر مجبور ہوتے کہ یہ شخص درحقیقت امیر ہے اور جواہرات کا حقیقی مالک ہے لیکن اس نے بھیس بدل رکھا ہے۔لوگ ایسے شخص کی تلاش میں ہوتے ہیں۔

بعض حاکم جواہرات مساجد میں رکھتے ہیں اور انھیں مساجد کے محافظوں میں تقسیم کرتے ہیں یا حفاظت کی غرض سے سرحدی محافظوں کی تحویل میں دیتے ہیں۔

خلفائے راشدین یا ان کے پیروکار خلفا مثلاً عمر بن عبدالعزیز اور کئی مروانی خلفا اور چند عباسی خلفاء کا طریق کار یہ تھا کہ وہ خلافت کو عیش و آرام کی بجائے بھاری بوجھ سمجھتے تھے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ وہ اس کی مہلک فطرت کو جانتے تھے۔

المغرب کے کسی شہر سے آنے والے ایک شخص نے بتایا کہ اس علاقے کی حکومت نوابوں میں باری باری بدلی جاتی ہے۔ ہر نواب رضا کارانہ طور پر تین ماہ بعد حکومت چھوڑ دیتا ہے اور اس کے بعد وہ خوشی خوشی صدقہ دیتا اور گھر کی طرف واپس لوٹ جاتا ہے جیسے وہ قید سے چھوٹا ہو اور اب روزمرہ زندگی کو واپس ہوا ہو۔ اس کا باعث یہی حقیقت ہے کہ حکومت و ریاست آرام و سکون ترک کرنے اور مظلوموں کو ظالموں سے نجات دلانے کا نام ہے تاکہ وہ انصاف پا کر اپنی جان و مال اور خاندان کا تحفظ پا سکیں۔ اسے ان کے مفادات اور جان و مال کے تحفظ کے لیے انتظام کرنا ہوتا ہے اور معاوضوں، تنخواہوں وغیرہ پر کڑی نظر رکھنا ہوتی ہے مثلاً کسی علاقے سے محافظین یا امیرِ کاروان وغیرہ کے معاوضے۔ اگرچہ امیرِ کاروان کے معاوضے کا معاملہ تو اب روایات کی تبدیلیوں کے باعث ختم ہو چکا، تاہم ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، اپنی روایات ہوتی ہیں جنھیں پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے ورنہ پورا نظام تباہ ہو جاتا ہے۔ حاکم کو مندرجہ بالا تمام روایات ملحوظ رکھنا ہوتی ہیں۔

ترویجہ

چاندی اور سونے کے برتنوں میں کھانا منع کر دیا گیا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے ان دھاتوں کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔ مزید یہ کہ قول شیطان یہ بیان ہوا ہے:

''......اور یقیناً میں انھیں حکم دوں گا اور وہ اللہ کی تخلیق کو بدل ڈالیں گے''۔ (النسا۴:۱۱۹)

یہ عین ممکن ہے کہ صناعی کے یہ احکامِ شرعی اس خیال سے ہوں کہ ایسے برتن بادشاہوں کے پاس ہوتے ہیں اور عوام کے ہاں نہیں ہوتے۔ انسان کو ہر وقت قسمت کے زیر و بم کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ کسی وقت غنی اور کبھی محتاج ہو سکتا ہے۔ اگر اپنی دولت کے بل بوتے پر استعمال کی اشیا کو وہ سونے چاندی کے برتنوں میں بدل لے تو قسمت کی تبدیلی انھیں درہم اور دینار میں بدلنے پر مجبور کر دے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ لوگ اس بات کو پالیں اور ان کے ارادے بدلنے لگیں اور وہ حوصلہ ہار بیٹھیں۔ دشمنوں کا حرص ایسے ضعف و افلاس کے وقوعات پر جھپٹ پڑے۔ انسان فطری طور پر خودغرض اور حریص ہے اور دوسروں کے حقوق غصب کر سکتا ہے۔

یہ احکامِ امتناع ممکن ہے مندرجہ بالا نکتے کے پیشِ نظر ہوں کیونکہ شریعت اچھے لوگوں اور امرا کی دنیا اور آخرت کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو صحیح نیت اور سوچ کی اہلیت عطا کرے تاکہ وہ اپنے اسلاف سے اخلاقی سبق حاصل کر سکیں۔ وہ ہمیں گناہ کے راستے سے بچائے اور اپنے بے پناہ کرم کے باعث غافلوں اور جعل سازوں کے شکنجوں سے محفوظ رکھے۔ [۱۰]

حواشی وتعلیقات

۱۔ انگریزی میں اس جملے کا دوبار ترجمہ کیا گیا ہے۔

۲۔ زندگی کے لیے حواس خمسہ کی فطری ضرورت کو بیان کیا ہے

۳۔ البیرونی نے وقف یا فاصلے کو ''ترویحہ'' کا نام دیا ہے۔ یعنی ایسا وقفہ جس کے بعد نیا تصور بیان کیا گیا ہو۔ گویا یہ ایک ذیلی جزو یا حصہ ہے۔

۴۔ سورتوں کے نام اور آیتوں کے نمبر متن سے زائد ہیں۔

۵۔ اشعار اصل عربی متن سے ہیں۔ اردو ترجمہ ایزاد ہے۔

۶۔ سونے اور چاندی کی جدید ضروریات کینسر کے علاج کے لیے سامنے آتی ہیں، عہدِ قدیم کی حکمت نے ان کے ورق تقویتِ غذا کے لیے تجویز کیے تھے۔

۷۔ زر یا سرمایہ ابتدا میں انھی قیمتی دھاتوں کو بنیاد بناتا ہے۔ دورِ جدید میں یہ اہمیت ختم ہو رہی ہے۔

۸۔ عصام نعمان بن مدثر کے حاجب کا نام تھا اور عظامی اسے کہتے ہیں جو پدرم سلطان بود کا نعرہ لگاتا ہے۔

۹۔ دیوان۔ مطبوعہ مصر، جلد ۲، صفحہ ۲۲۱

۱۰۔ البیرونی ایسے احکامِ شریعت کی روح جاننے کا خواہش مند نظر آتا ہے جن میں بظاہر ان اشیا کی حرمت کا ذکر ہے جو وقتی ہوتی ہیں جیسے سونا، چاندی، آلاتِ موسیقی، ظروف، ہتھیار وغیرہ۔ کسی اور زمانے میں ہوسکتا ہے کہ ان کی وہ اہمیت نہ ہو جو نزولِ قران کے دور میں انھیں حاصل تھی۔ ایسی آیات کی تفسیر میں ان کے مفاہیم مراد لیے جانے کا امکان البیرونی کو بے چین رکھتا ہے۔ چنانچہ سونا چاندی سے مراد دولت اور ذخیرہ کرنے سے مراد مارکیٹ میں گردشِ زر سے روکنے کی ایک کوشش ہوسکتی ہے۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ

۱۔ احمد، ایم، آر، بہاری؛ بی وی سوبریاپا، ۱۹۷۵ء، *Biruni: An Introduction to his Life and Writings on the Indian Sciences "Indian J. History Sci.10(2)*، انڈین جرنل آف ہسٹری آف سائنس، ۱۰(۲)، ص: ۹۸۔۱۱۰

۲۔ البیرونی: محمد بن احمد، مرتبہ: فرٹز کرینکو، ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء، **کتاب الجماہر فی معرفۃ الجواہر** (عربی)، عثمانیہ اورینٹل پبلی کیشن، حیدرآباد، دکن۔

۳۔ البیرونی: محمد بن احمد، ترجمہ انگریزی: حکیم محمد سعید، ۱۴۱۰ھ/ ۱۹۸۹ء، *Book on Precious Stones*، **کتاب الجماہر فی معرفۃ الجواہر**، سو عظیم کتب، ہجرہ کونسل، اسلام آباد۔

۴۔ براٹوف، آر بی، ۱۹۷۳ء، *Beruni Great Scientist of the Orient*، ایل زیڈوی، اے کے اے ڈی، نوک تاجک، ریاست سوویت روس، نوک *Fiz-Mat-i Geology-Him*، نوک، (۳)(۴۹)، ص ص: ۳ تا ۵

۵۔ بوئیلوٹ، ڈی جے؛ ایل اودرے، ۱۹۵۶ء، *Al-Biruni=Essai Bibliographique*، d، MIDEO، ii، ص ص: ۱۶۱۔۲۵۶، iii، ص ص: ۳۹۱۔۳۹۶

۶۔ راشد، رشدی؛ مورلین، ریگس، ۱۹۹۶ء، *Encyclopedia of History of Arabic Science,* 1&3، روٹ لیج۔

۷۔ روزن فیلڈ، بی اے؛ ایم ایم روژانسکیا؛ زیڈ کے سکولوفسکیا، ۱۹۷۳ء، *Abu'-Rayhan al-Biruni*، ماسکو (روس)

۸۔ سعید، حکیم محمد، مرتبہ، ۱۹۷۹ء، *Biruni Commemorative Volume: Proceedings of the International Congress held in Karachi, November 26-December 12,1973*، کراچی
۹۔ کونگٹن، رچرڈ، مئی جون ۲۰۰۷ء، *"Rediscovering Arabic Science", Saudi Arab World*، ص ص: (۲۔۱۶)
۱۰۔ کینیڈی، ای ایس، ۸۰۔۱۹۷۰ء، *"Beruni Abu Rayhan, al-" Dictionary of Scientific Biography*، نیویارک: چارلس سکر بنرز سنز
۱۱۔ گلک، تھامس ایف ؛ لیوییے، سٹیون جان؛ ولیس، فیتھ، *Medieval Science Technology and Medicine: An Encyclopedia*، روٹ لیج

برقی مآخذ:

۱۔ "On Stones":Biruni' works
(http://www.Farlong.com/gemstones/biruni-book)
مکمل متن مع تبصرات۔
۲۔ البیرونی(www.fantasticasia.net---Alburuni)
۳۔ www.al-qalam.org/index.php
۴۔ www.muslimheritage.com
۵۔ encyclopedia iranica "Biruni" (www.iranica.com)

Abstract

The Book on Precious Stones, Fascicle 1 by Muhammad Ahmed Alberuni (362H/973A.D- 440H / 1048 A.D) is a most valuable book on gemmology and Physical chemistry. Its literary style is also noteworthy. The Arabic Text was edited by Fritz Kren kow and published in 1355 H / 1936 A.D. from Hyderabad/ Deccan. The English Text was Translated by Hakeem M. Saeed (Said) and was published by Hijra Council Islamabad in 1410H/1989. It is now being translated in Urdu with annotation and modern comparative studies. The Urdu Translation of its 1st fascicle is presented here because of its literary worth.